جنوری ۲۰۰۱

جاری کردہ
سید ابو الاعلیٰ مودودی

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

اہل کشمیر

کی بے مثال جدوجہد کو سلام

سال	1988	1989	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ٹوٹل
شہدائے کشمیر	419	4021	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	62,000
اسیران کشمیر	6921	10,842	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	103,500
جائیدادوں کا نذر آتش	2391	4972	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	27,000
خواتین کی بے حرمتی	563	723	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	17,000

اُن کیلئے کچھ کریں جو اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں قربان کر رہے ہیں

جماعت اسلامی مجاہدین کی امداد، زخمیوں کے علاج، شہداء کے گھرانوں کی معاونت اور مہاجرین و متاثرین کی بحالی کے لئے سرگرم عمل ہے۔

رمضان المبارک میں زکوٰۃ، صدقات اور عطیات دے کر جہاد کشمیر میں حصہ لیجیے

نقدی / چیک / ڈرافٹ / کپڑے وغیرہ جماعت اسلامی کے مقامی دفاتر یا براہ راست ارسال فرمایئے۔

قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی پاکستان منصورہ، ملتان روڈ لاہور

فون: 5419520-4, 7844605-9 فیکس: 7832194

URL: http://www.jamaat.org

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد ۱۲۸' عدد ا' جنوری ۲۰۰۱ء' شوال ۱۴۲۱ھ

مدیر:

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر:

مسلم سجاد

مدیر انتظامی:

عبدالکریم

ادارتی امور:

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

انتظامی امور:

۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

www.tarjumanulquran.com

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زرسالانہ: ۲۰۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے

بنگلہ دیش' ایران ۵۰۰ روپے

مشرق وسطیٰ' یورپ' مشرق بعید' افریقہ ۷۰۰ روپے - امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

سید احمد شہیدؒ کی تحریک

[سید احمد شہیدؒ کی] اس تحریک سے ہندستان کے لاکھوں مسلمان وابستہ تھے اور سارے برطانوی علاقے میں اس کے مرکز قائم تھے۔ سید صاحبؒ نے اپنا اصل مرکز ہندستان کی شمالی سرحد کو بنایا جو ایک آزاد اور جنگجو علاقہ تھا اور جس سے آزاد مسلم سلطنتوں اور قوموں کا علاقہ متصل تھا۔ اُس وقت تک آپ کا محاذ جنگ پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا جس کے علاقے میں مسلمان مذہبی آزادی اور شہری حقوق سے محروم تھے۔ لیکن آپ کا ارادہ تھا کہ قوت کے فراہم ہو جانے اور مرکزیت قائم ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہندستان میں ایک آزاد شرعی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے اور غیر مسلم اقتدار کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کو ابتدا میں پوری کامیابی ہوئی۔ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سرحدی قبائل' امرا و خوانین' ہندستانی مجاہدین اور علما و مشائخ نے بالاتفاق آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت و خلافت کر لی' بیت المال قائم ہو گیا' زکوٰۃ و عشر کا نظام اور شرعی حدود و تعزیرات جاری ہو گئے۔ کچھ مدت اور متعدد جنگوں کے بعد پشاور مفتوح ہو کر نئی اسلامی حکومت میں داخل ہو گیا۔

لیکن پھر مسلمانوں کی خیانت اور غداری اور ناسازگار حالات کے سبب مجاہدین اسلام کو شکست ہوئی۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل صاحبؒ بعض دوسرے رفقا و مجاہدین کے ساتھ مقام بالاکوٹ (ہزارہ) میں شہید ہو گئے اور آپ کی باقی ماندہ جماعت نے سرحد میں ستھانہ اور ہندستان میں پٹنہ میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔...

ہندستان کے مرکز صادق پور پٹنہ نے ہندستان کے مسلمانوں کی وہ بے نظیر تنظیم اور جہاد کی وہ عظیم الشان تبلیغ و تربیت کی جس کی مثال مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لے کر اس وقت تک نہیں ملتی۔ اس تنظیم و تبلیغ کی وسعت' اس اسلامی نظام کی برتری' اور ان علما کی سیاسی قابلیت اور انتظامی لیاقت کا تصور کرنے کے لیے اس تحریک کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی کتاب ''مسلمانان ہند'' کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھنے چاہییں:

> ''یہ لوگ مشنریوں کی طرح ان تھک کام کرتے تھے۔ بے لوث اور بے نفس لوگ تھے جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ روپیہ اور آدمی فراہم کرنے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں عزت وعظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لیے اپنی جاں فشانی اور جوش قائم رکھتے''۔

(''تفریق دین و سیاست''، مولانا ابوالحسن علی ندوی' ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۱۷' عدد ۴-۵' شوال و ذی القعدہ ۱۳۵۹ھ' دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء' ص ۳۷۴-۳۷۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

عدل‘ محاسبہ‘ قومی وقار اور خود مختاری

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پروفیسر خورشید احمد

پاکستان کی ۵۳ سالہ تاریخ میں قومی سطح پر ہماری قیادتوں نے غلطیاں‘ زیادتیاں‘ قانون کی خلاف ورزیاں اور مظالم‘ تو بے شمار کیے ہیں لیکن یہ سانحہ پہلی بار موجودہ حکومت کے ہاتھوں رونما ہوا ہے کہ ایک بااثر قومی مجرم اور اس کے پورے گھرانے کو اسلامی اصول و احکام‘ ملکی دستور و قانون‘ قومی رائے اور جذبات و احساسات اور عالمی سطح پر جرم و سزا کے معروف ضابطوں کو یکسرنظرانداز کر کے شرم ناک سودے بازی کر کے ملک سے فرار کرا دیا گیا بلکہ فرار کی شاہانہ سہولتیں مہیا کی گئیں اور المیہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ موجودہ حکومت کے ہاتھوں ہوا اور عدالتوں کی دی ہوئی سزاؤں کو ’’معاف‘‘ یا نظرانداز کر کے اسے ’’ملک و قوم کے بہترین مفاد میں فیصلہ‘‘ قرار دینے کی جسارت کی گئی۔

بلاشبہ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۰ء ہماری تاریخ کا ایک تاریک ترین دن تھا۔

یہ اقدام ایک ناقابل معافی قومی اور اخلاقی جرم ہے۔ معاملہ افراد کا نہیں‘ اصولوں کا ہے‘ ہمیں نہ نواز شریف سے کوئی دشمنی ہے اور نہ پرویز مشرف سے کوئی پرخاش۔ لیکن یہ قوم اور ملک ہمیں عزیز ہیں۔ اسلام کے اصول و احکام اور ملک کا دستور اور قانون ہماری نگاہ میں وہ میزان ہیں جن پر ہر کسی کے عمل کو پرکھا جانا چاہیے اور جو بھی ان اقدار کو پامال کرے جن پر ہمارا ایمان‘ ہماری آزادی اور ہماری سلامتی کا انحصار ہے اس پر گرفت ایک دینی اور قومی فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں کسی بھی درجے کی مداہنت دنیا میں بربادی اور آخرت میں خسارے کا باعث ہو گی۔ یہی جذبہ ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس گھناؤنے اقدام کا بھرپور محاسبہ کریں‘ اس

کے مضمرات سے ملک وملت کو آگاہ کریں اور قوم کو مزید تباہی سے بچنے کے راستے کی نشاندہی کریں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسلام کی تعلیمات اور انسانی تاریخ کے تجربات کا نچوڑ ایک جملے میں بیان فرما دیا ہے کہ ''معاشرہ کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتا ہے لیکن انصاف کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا''۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام اور پھر اپنے آخری پیامبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی زمین پر جس مقصد و ہدف کے حصول کے لیے بھیجا وہ تھا: تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ انسانوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام اور اسی بنیاد پر معاشرے اور ریاست کی تعمیر وتشکیل۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا' اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

حضور اکرمؐ کی زبانی صاف الفاظ میں اعلان فرمایا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۗ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو' اور جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو کہ: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۗ (النساء ۴:۵۸)

مسلمانو' اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

اسلام اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ خود اپنی ذات' باپ بیٹے' امیر غریب اور دوست و دشمن میں بھی کوئی تمیز گوارا نہیں کرتا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا o (النسا، ۴:۱۳۵)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتے داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے۔

ایک مسلمان ہمیشہ عدل و انصاف کا علم بردار ہوتا ہے--- دوست ہی نہیں دشمن سے بھی عدل سے پیش آنا مسلمان کا شیوہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ o (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

انصاف کے معاملے میں اسلام کی حساسیت کا ایک بڑا ہی اہم اور نازک پہلو یہ ہے کہ وہ جرم و سزا کو قانون کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اور اس میں نہ کوئی اضافہ گوارا کرتا ہے اور نہ کمی۔ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جا رہی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ ط وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا o وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا o وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا o (النساء۴:۱۰۵-۱۰۷)

اے نبیؐ' ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمھیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے

والے نہ بنو اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔

جرم کے ثبوت کے بعد اس کے مرتکبین کے لیے نرمی اور رعایت کی بات انصاف کے منافی اور جرم و سزا کے قانون کو غیر موثر کرنے کے مترادف ہے۔ زنا کی سزا کے باب میں قرآن کا صاف ارشاد ہے:

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ (النور ۲۴:۲)

اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

یہی اصولی بات قتل کے سلسلے میں بیان فرمائی:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (البقره ۲:۱۷۸-۱۷۹)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تمھارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے' غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے' اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں' اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے' اس کے لیے دردناک سزا ہے---عقل و خرد رکھنے والو' تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

واضح رہے کہ خوں بہا کا حق و اختیار حکومت کو نہیں' جس کا حق مارا گیا ہے اس کو حاصل ہے۔ جرم و سزا کے بارے میں امیر غریب' عالی نسب اور عامی' بااثر اور کمزور میں تمیز و فرق اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''لوگو' تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں' وہ ہلاک ہوگئیں اس لیے کہ جب ان کا کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے''۔ اور آپؐ نے فرمایا کہ ''اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ قطع کر دیے جاتے''۔ سزا میں تخفیف اور اضافہ بھی انصاف کے منافی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

''قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا کہ یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا کہ آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہوگا تو ان کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا؟ پھر حکم ہوگا لے جاؤ اسے دوزخ میں۔ ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا تو نے یہ کس لیے کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا تاکہ لوگ آپ کی نافرمانی سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا: اچھا تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا؟ پھر حکم ہوگا لے جاؤ اسے دوزخ میں (بحوالہ تفسیر کبیر' ج ۶' ص ۲۳۵' تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۴۴)

ان احادیث کا تعلق حدود سے ہے لیکن اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ مجرم کا جرم ثابت ہونے کے بعد انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس کو بلادلیل اور قانونی تقاضے پورے کیے بغیر نہ چھوڑ دیا جائے --- اور اس کی سزا میں کمی نہ کی جائے بلکہ پورا عمل عدل و انصاف کے مطابق ہو اور جس پر جو حق واجب ہے اسے بلاکم و کاست وصول کیا جائے اور حق داروں کو پہنچایا جائے۔ اسی لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کی نگاہ میں ہر قوی کمزور ہے جب تک کہ اس سے حق دار کے حق واپس نہ لے لیں اور ہر محروم قوی ہے جب تک کہ اس کا حق اسے دلوا نہ دیں۔

جس سرزمین پر عدل کا نظام موجود نہ ہو' جہاں قانون کی حکمرانی نہ ہو' جہاں طاقت ور محض اپنی دولت اور اثر و رسوخ کی بنا پر حق داروں کا حق مار کر دندناتا پھرے اور مظلوم اپنے حق سے محروم رہے اُسے اسلامی تو کیا' ایک مہذب معاشرہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چرچل نے دوسری جنگ کے عین ان لمحات کے موقع پر جب برطانیہ کا ہر گھر جرمنی کی توپوں کی زد میں تھا' کہا تھا: ''یہ ملک محفوظ ہے اگر اس کا عدالتی نظام ٹھیک کام کر رہا ہے اور لوگوں کو انصاف مل رہا ہے''۔

جس معاشرے سے انصاف اٹھ جائے سمجھ لیجیے کہ اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔

موجودہ حکومت نے نواز شریف اور ان کے خاندان کو جس طرح معافی دی ہے اور اعزاز کے ساتھ ملک سے رخصت کر دیا ہے اس عمل میں اس نے ایک نہیں حسب ذیل سات بڑے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا

ہے اور اسے ان سب ہی کے بارے جواب دہی کرنا ہوگی:

۱- عدلیہ کی تضحیک اور قوم سے بے وفائی: پہلا جرم یہ کہ ایک ایسے شخص کو' جسے ملک کی عدالتوں نے کم از کم دو مقدمات میں مجرم قرار دے کر سنگین سزائیں دی تھیں' بلا جواز و اختیار معافی دے کر انصاف کا خون کیا ہے۔ حکومت خود ان معاملات میں مدعی تھی اور ایک مقدمے کے بارے میں عدالت سے سزا میں کمی نہیں' مزید اضافے کی درخواست کر رہی تھی۔ نیز مختلف عدالتوں میں اسی (۸۰) کے قریب دوسرے مقدمات دائر ہو گئے تھے یا دائر کیے جانے کے مراحل میں تھے۔ ایک خاندان جس کے بارے میں ملک اور عالمی اخبارات اور رسائل میں اربوں روپے کے غبن اور لوٹ مار کی شہادتیں پیش کی جا رہی تھیں اور خود حکومت ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے اقدام کے جواز میں جن جرائم کا شب و روز ذکر کر رہی تھی اور جن کی بنیاد پر عدالت عالیہ نے ۱۲ اکتوبر کے اقدام کو ایک گونہ جواز (validation) فراہم کیا تھا' ان سب سے بیک چشم صرفِ نظر کر کے محض چند ایسے اثاثوں کو اپنی تحویل میں لے کر' جن کی مالیت اصل لوٹ کھسوٹ کا عشر عشیر بھی نہیں' اس نے شدید ترین بدعنوانی اور بے انصافی کا ارتکاب کیا ہے۔ جرم کرنے والے اس جرم پر پردہ ڈالنے یا مجرم کو بچانے والے اور حق دار کو (جو اس معاملے میں پوری پاکستانی قوم ہے محض کوئی حکمران نہیں) اپنے حق سے محروم کر دینے والے بھی جرم میں اسی طرح شریک اور ذمہ دار ہیں جس طرح اس کا اصل ارتکاب کرنے والے۔ نواز شریف ہوں یا بے نظیر یا کوئی اور سابق حکمران--- ان پر الزام ہی یہ ہے اور عدالتوں اور قوم کے اجتماعی ضمیر نے اس الزام کی توثیق کی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے دورِ اقتدار میں امانتوں میں خیانت کی ہے' اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے' دستور اور قانون کی دھجیاں بکھیر دی ہیں' قومی خزانے کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور ملکی وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ ملکی دولت بیرون ملک منتقل کی ہے اور ملک و قوم کو اپنے ہی وسائل سے محروم کر کے غربت اور افلاس اور بے روزگاری کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔

نواز شریف صاحب ۱۹۸۱ء سے کسی نہ کسی صورت میں برسرِ اقتدار رہے ہیں۔ اس زمانے میں ان کا خاندان ملک کا پانچواں امیر ترین خاندان بن گیا۔ ان بیس سال میں محض چند لاکھ کی حیثیت والے اس خاندان کے اثاثوں کی مالیت ۱۰ ارب روپے سے زیادہ ہوگئی اور ۵ سو ملین ڈالر سے زیادہ (ایک اندازے کے مطابق ایک بلین ڈالر) ملک کے باہر منتقل کرنے کا مرتکب ہوا۔ اس عرصے میں اس خاندان کے ۳۴ صنعتی یونٹ وجود میں آئے جو ۳۰ چھوٹے بڑے مالیاتی اداروں سے قرض لے کر اور قرض کی بڑی بڑی رقوم معاف کرا کر قائم کیے گئے۔ صرف ایک حبیب بنک سے ایک ارب روپے قرض لیے گئے۔ دوسرے بنکوں اور مالیاتی اداروں کے واجب الادا قرضوں کی مالیت ۵ ارب سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح ڈیڑھ ارب روپے سرکاری

خزانے کے ٹیکسوں کی شکل میں واجب الادا بتائے جاتے ہیں (ملاحظہ ہو جنگ' ۱۱ دسمبر ۲۰۰۰ء- جولندن کے اخبارات گارڈین اور انڈی پینڈنٹ کی رپورٹوں پر مبنی ہیں جن کی صحت پر اخبارات نے شریف خاندان کو عدالتی کارروائی کا چیلنج دیا تھا مگر انھوں نے ان اخبارات کے خلاف کوئی عدالتی چارہ جوئی نہیں کی)۔

جس خاندان نے ملک و قوم کو اس بے دردی سے لوٹا ہو' اسے معافی دینے اور ملک سے فرار کی اجازت دینے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں تھا۔ یہ اقدام اسلام' دستورِ پاکستان' قانونِ احتساب اور سب سے بڑھ کر پاکستان اور پاکستانی قوم سے کھلی کھلی بے وفائی ہے۔ معافی اور فرار کا ڈراما رچا کر موجودہ حکومت بھی ان جرائم میں اتنی ہی شریک اور ذمہ دار ہوگئی ہے جتنا ان کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔

۲- دستور کی کھلی خلاف ورزی: دوسرا جرم دستور کی کھلی کھلی خلاف ورزی ہے۔ دستور پاکستان کی دفعہ ۴ میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ: ہر شہری خواہ کہیں بھی ہو' اور کسی دوسرے شخص کا جو فی الوقت پاکستان میں ہو' یہ ناقابل انتقال حق ہے کہ اسے قانون کا تحفظ حاصل ہو اور اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے۔

اسی طرح دفعہ ۱۵ میں ہر شہری کے لیے نقل و حرکت اور پاکستان میں کہیں بھی قیام کا حق تسلیم کیا گیا ہے الا یہ کہ کسی قانون کے تحت کسی کو اس سے محروم کیا جائے۔ دستور میں ملک بدری (deportation) کا کوئی حق حکومت کو نہیں دیا گیا۔ بین الاقوامی قانون کے تحت کسی شخص کو اس کی شہریت سے محروم کیے بغیر ملک سے نہیں نکالا جا سکتا اور یہ عمل بھی عدالتی فیصلے کے تحت ہو سکتا ہے' محض انتظامی حکم (executive order) سے نہیں۔ دفعہ ۲۵ میں تمام شہریوں کی برابری اور قانون کے مساوی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسی طرح دستور کی دفعہ ۴۵ میں معافی یا سزا میں کمی کا جو حق دیا گیا ہے وہ صرف عدالتوں کے آخری فیصلے کے بعد ہے اور دستوری اور قانونی عرف کے مطابق بالعموم صرف موت کی سزا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اب دیکھیے اس اقدام کی صورت میں کس طرح دستور کی ان تمام دفعات کی کھلی کھلی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

(i) جن دو مقدمات کی سزائیں معاف کی گئی ہیں وہ ابھی عدالتوں میں زیرِ غور ہیں اور حکومت اور ملزم دونوں کی طرف سے اپیل کے درجے میں ہیں۔ دستور کی دفعہ ۴۵ کا اطلاق ایسے معاملات پر نہیں ہوتا۔

(ii) ابھی ان ملزموں کے خلاف ۸۰ کے لگ بھگ مقدمات احتساب کی اور دوسری عدالتوں میں پیش ہونے کے لیے تیار کیے جا رہے ہیں۔ ان سارے معاملات میں یک طرفہ طور پر ملزمان کو فرار کی راہ دکھانا (بلکہ عملاً فرار کرانا) دستور اور قانون کا خون کرنے اور جرم کی سرپرستی اور اس میں شرکت کے مترادف ہے۔

(iii) ایک ہی جرم میں شریک مختلف مجرموں کے درمیان تمیز اور فرق دستور اور اسلامی اصول کے منافی ہے۔

(iv) ملک بدری کی کوئی سزا کتاب قانون میں موجود نہیں۔ ایسی کوئی سزا دینے کا کوئی مجاز نہیں جو قانون کی نگاہ میں سزا نہ ہو۔ اسی طرح ملک بدر کرنے یا ملک میں واپسی کے حق سے کسی کو عدالتی کارروائی کے بغیر محروم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی مشتبہ ہے کہ عدالتی فیصلے کے ذریعے بھی کسی کو اپنے ملک میں داخل ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ آنے والے کو قانون کے مطابق گرفتار تو کیا جا سکتا ہے لیکن ایک شہری کو ملک میں داخلے کے حق سے محروم کرنے کا اختیار دستور اور قانون کے تحت کسی کو حاصل نہیں۔

(v) اگر چند ملزموں کو اس طرح سودا بازی کے ذریعے سرکاری اہتمام میں ملک کے باہر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے تو پھر کس قاعدے اور قانون کے مطابق دوسروں کو اس ''حق'' سے محروم رکھا جا سکتا ہے یا ان افراد کو زبردستی ملک میں لایا جا سکتا ہے جو ایسے ہی جرائم کا ارتکاب کر کے ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔ خود دوسرے ممالک سے ایسے لوگوں کے بطور ملزم حوالگی (extradition) کا بھی کیا اخلاقی جواز باقی رہ جاتا ہے؟

یہ وہ چند پہلو ہیں جن کے بارے میں دستور اور خود اسلام کے اصول انصاف کی کھلی کھلی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

۳- بااثر اور کمزور میں فرق کی شرم ناک مثال: تیسرا بڑا جرم اس اقدام کے ذریعے یہ کیا گیا ہے کہ امیر اور غریب' بااثر اور کمزور' بیرونی سرپرستی رکھنے والے اور بیرونی سرپرستی سے محروم انسانوں کے درمیان فرق کی ایک شرم ناک مثال قائم کی گئی ہے۔ نیز مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے کے درمیان تمیز و فرق کی بات بھی کی جا رہی ہے۔ ایک ہی جرم کے مرتکب انسانوں کے درمیان تمیز اور فرق کا جو رواج ازمنہ قدیم کے براہمنی' یا ایسے ہی دوسرے ظالمانہ اور جابرانہ نظاموں میں پایا جاتا تھا اور جسے اسلام اور خود دورِ حاضر کے قانونی نظاموں نے ختم کر دیا تھا اس کا بدقسمتی سے ہمارے ملک میں احیا کیا جا رہا ہے۔ بے نظیر' الطاف اور ایسے دوسرے بہت سے افراد تو خود ملک سے بھاگ گئے ہیں لیکن یہ ''اعزاز'' اس حکومت کو اور امریکہ اور مشرق وسطی کے بادشاہوں کے منظور نظر اس گھرانے کو جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں حاصل ہوا ہے کہ قومی مجرموں کو قانون اور انصاف کی گرفت سے نکال کر لوٹی ہوئی دولت سے شادکام ہونے کے لیے شاہی انتظام میں رخصت کر دیا گیا ہے۔ چند ہزار روپوں کا غبن کرنے والے تو جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور موٹر سائیکل پر محض دہری سواری کرنے والے تو پابند سلاسل ہیں لیکن اربوں روپے لوٹنے والے اور پوری قوم کو غلام بنانے والوں کے لیے آرام کے ساتھ سرکاری سرپرستی میں فرار کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قانون صرف کمزوروں اور چھوٹے

لوگوں کے لیے ہے۔ بڑی مچھلیوں پر اسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہ انصاف کا خون اور فرعونی روایات کا فروغ ہے۔ تفو! بر تو چرخ گرداں تفو!

۴- احتساب کے نام پر مذاق: فوجی حکومت اس دعوے کے ساتھ وجود میں آئی تھی کہ مجرموں کو کیفرکردار تک پہنچائے گی' لوٹی ہوئی دولت ہی واپس نہیں لائے گی بلکہ لوٹنے والوں کو بھی دنیا کے کونے کونے سے پکڑ کر قانون کی گرفت میں لے کر قرار واقعی سزا دے گی۔ لیکن اس اقدام کے ذریعے اس نے قومی دولت کو لوٹنے والے سب سے بڑے ٹولے کو باعزت معافی دے کر ملک سے خود ہی رخصت کر دیا۔ اب دوسروں کی گرفت کا کیا جواز باقی رہا ہے؟ اس اقدام نے احتساب کے پورے عمل کو محض ایک ڈھونگ اور تماشے میں بدل دیا ہے۔ اب احتساب کے موجودہ نظام کا کوئی سیاسی' قانونی اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہا ہے۔ ملک اور ملک سے باہر اس نظام پر کوئی اعتماد نہیں کر سکتا۔ ایک طرف عدالتی نظام اور قانون کی حکمرانی کے اصول کو پامال کیا گیا ہے تو دوسری طرف احتساب کے پورے نظام کو ایک مضحکہ بنا کر غیر موثر کر دیا گیا ہے جس پر [اعتماد اور بھروسے والی کوئی بات] اب باقی نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا ظلم ہے جس کی تلافی مشکل ہے۔

۵- ملکی وقار اور خود مختاری پر شدید ضرب: اس اقدام کے لیے کھلے اور چھپے جو قوتیں کام کرتی رہی ہیں اور جس جس بیرونی دباؤ کے آگے ہتھیار ڈالنے کی یہ حکومت مرتکب ہوئی ہے اس نے ملک کے وقار اور خود مختاری پر شدید ضرب لگائی ہے۔ ایک عرب ملک کا کردار تو بہت نمایاں ہے جس کا اعتراف خود سرکاری اعلان میں موجود ہے لیکن بات ایک ملک کی نہیں' کئی ملکوں کی ہے۔ اب تو وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے صاف اعتراف کر لیا ہے کہ ہم اس سلسلے میں برابر دباؤ ڈال رہے تھے اور اس اقدام پر خوش ہیں۔ اس طرح کلنٹن صاحب نے ان خدمات کا حساب چکا دیا ہے جو سابق وزیراعظم نے بھارت نوازی' کارگل سے پسپائی' ورلڈ بنک اور امریکہ کی معاشی بالادستی' افغانستان پر حملوں میں درپردہ معاونت' کانسی کی ملک بدری' جوہری صلاحیت کی تحدید اور نہ معلوم کس کس شکل میں انجام دی تھیں۔ سوال صرف سابق حکمرانوں کی مغربی اقوام کی کاسہ لیسی ہی کا نہیں' موجودہ حکمرانوں کا ان کے مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا بھی ہے--- اور اس میں جو خطرات آیندہ کے لیے مضمر ہیں' وہ ہوش اڑا دینے والے ہیں۔ مغرب کے ایجنڈے میں افغانستان پر دباؤ' اسامہ بن لادن کی گرفتاری' کشمیر میں جنگ بندی اور بھارت اور امریکہ کی شرائط پر سمجھوتہ کاری' قرضوں کی غلامی اور معاشی محتاجی میں اضافے اور بالآخر نیوکلیر صلاحیت سے محرومی اور اسلام سے بنیاد پرستی (فنڈمنٹلزم) کے نام پر عملی دست برداری آگے کے اہداف ہیں۔ جو حکومت قومی مجرموں کو اپنے دستور اور قانون کے مطابق اپنے دائرہ اختیار میں نہ رکھ سکی اس سے قومی سلامتی کے دوسرے محاذوں پر مضبوطی کی توقع

عبث ہے۔ فوجی قیادت کے بارے میں قوم کو توقع تھی کہ وہ سیاسی قیادتوں کے مقابلے میں بیرونی اثرات سے ملک کو محفوظ رکھنے میں زیادہ مستعد ہوگی لیکن یہ بڑی تشویش ناک بات ہے کہ خود فوجی قیادت اس محاذ پر کمزوری اور پسپائی دکھا رہی ہے۔ گویا ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے''۔ اس طرح حکومت نے اپنی ساکھ (credibility) کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

۶- حکومت کا جواز سے محروم ہو جانا: ایک اور اہم پہلو اس اقدام کا یہ ہے کہ اس کے ذریعے موجودہ حکومت نے خود اپنے کو اس جواز (legitimacy) سے محروم کر دیا ہے جو سپریم کورٹ کے فیصلے کے ذریعے اسے حاصل ہو گیا تھا۔ ۱۲ اکتوبر کے اقدام کا اگر کوئی جواز تھا تو وہ سابقہ حکومت کے کرتوت اور ان کو قرار واقعی سزا دیے جانے کا امکان اور انتظام تھا۔ اسی وعدے کے ساتھ جنرل صاحب نے یہ اقدام کیا تھا اور انھی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سپریم کورٹ نے انھیں سند جواز مرحمت کی تھی۔ لیکن اگر اس مجرم ہی کو معافی دے دی گئی ہے اور اس کے سارے جرائم پر نہ صرف یہ کہ پردہ ڈال دیا گیا ہے بلکہ ساری لوٹ کھسوٹ کو بھی ایک طرح تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے تو پھر اسے ہٹانے والوں کے باقی رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس اقدام کی شکل میں جنرل صاحب نے وہ کام کیا ہے جو اس بڑھیا نے کیا تھا جس نے جو سوت کاتا اسے اپنے ہی ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ویسے بھی حکومت کی ۱۴ ماہ کی کارکردگی ہر میدان میں نہایت مایوس کن ہے لیکن اس اقدام کے بعد تو اب اس کے باقی رہنے اور سپریم کورٹ کی عطا کردہ مدت پوری کرنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جلد از جلد اقتدار عوام کے اصل نمایندوں کی طرف منتقل کیا جائے۔

۷- اسلام کے اصول انصاف سے انحراف: ساتواں اور ان سب جرائم کا جامع جرم اسلام کے اصول انصاف اور جرم و سزا کے درمیان نسبت اور تعلق کے نظام کو درہم برہم کر دینا ہے۔ پاکستان بہت سے دوسرے ممالک کی طرح' محض ایک ملک نہیں' ایک اسلامی ملک ہے۔ اس کے دستور نے قرآن و سنت کی بالادستی کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اس قوم کی منزل اسلامی ریاست اور معاشرے کا قیام ہے۔ ہم نے اپنی معروضات کا آغاز اسلام کے اصول انصاف کے خلاصے ہی سے کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر کا اقدام اسلام کے ہر اصول سے انحراف اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے کھلے احکام کی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ خلاف ورزی ہے۔ اس میں پاکستان کی حکومت اور عرب ممالک کی مسلمان حکومتیں برابر کی شریک ہیں۔ نواز شریف کی فیملی بھی اپنے اصل جرائم کے ساتھ خدا کے قانون جرم و سزا سے بغاوت کی مرتکب ہوئی ہے۔ انسان سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کا رویہ غلطی پر ندامت اور اللہ سے عفو و درگزر کی طلب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں جرم پر کوئی ندامت کہیں دور دور نظر نہیں آ رہی بلکہ چوری اور سینہ زوری کی روش اختیار کی جا رہی ہے جو

خدا اور خلق دونوں کے خلاف بغاوت کی ایک صورت ہے۔ مجرموں کو بچانے کی خدمت جو جو افراد اور قوتیں انجام دے رہے ہیں وہ سب اس بغاوت میں شریک اور معاون ہیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والا اور جرم میں معاونت کرنے والے دونوں قانون اور انصاف کی نگاہ میں مجرم ہیں۔ مجرم کو تحفظ دینا بھی ایک جرم ہے۔ ۱۰ دسمبر کے اقدام نے ان سب کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے اور اب ان سب ہی مجرموں سے نجات میں ہماری بقا اور ترقی کا راز ہے۔

اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ جنرل صاحب اور ان کی ٹیم مستعفی ہو' عدلیہ کے تحت غیر جانب دارانہ مگر قابل اعتماد افراد پر مشتمل عبوری انتظام بنایا جائے' مکمل طور پر آزاد انتخابی کمیشن مقرر کیا جائے اور ایک معقول مدت میں نئے انتخابات کے لیے قوم کو اپنی نئی قیادت منتخب کرنے کا موقع دیا جائے جو ملک کے حالات کو سدھارنے کی جدوجہد کرے اور ملک و قوم کے مجرموں کو بھی قرار واقعی سزا دینے کا اہتمام کرے۔ یہ کئی وجوہ سے ضروری ہے:

اولاً' موجودہ حکومت ناکام رہی ہے اور اسے جو موقع ملا تھا' اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلا کر اسے ضائع کر دیا ہے۔ یہ حکومت نہ احتساب کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اور نہ اس پر اب احتساب کے باب میں کسی درجے میں بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ معیشت بھی خراب سے خراب تر ہوئی ہے۔ اسٹیٹ بنک کی تازہ رپورٹ اس کا ثبوت ہے جو آیندہ بھی اشیاے صرف کی قیمتوں اور بجلی کے نرخوں میں مزید اضافے اور مزید بے روزگاریوں کی بھیانک پیشن گوئیاں کر رہی ہے۔

اس حکومت نے اپنی ہی قوم کے مختلف عناصر سے غیر ضروری محاذ آرائی کا راستہ اختیار کر کے حالات کو خراب کیا ہے۔ جس نئے نظام کی یہ نوید سناتی رہی ہے' اسے عوام میں کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی ہے جس کا ثبوت بلدیات کے انتخابات میں عوام کی مکمل عدم دل چسپی ہے جسے ایک حد تک اس نظام اور اس حکومت کے خلاف ریفرنڈم قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر جس طرح اس نے اپنے آپ کو بیرونی دباؤ کے لیے نرم نوالہ بنا دیا ہے' اس سے تو اس کا اعتبار بالکل ہی غارت ہو گیا ہے۔ اس کی یہ کمزوری اپنے اندر بڑے خطرات لیے ہوئے ہے۔ قومی سلامتی کا تقاضا ہے کہ نئی' قابل اعتماد اور عوام کی معتمد علیہ قیادت جلد از جلد زمام کار سنبھالے۔ یہ اب وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ ۱۰ دسمبر کو ہوا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا رہا' یعنی ۱۹۷۱ء کا سانحہ' کارگل کی پسپائی وغیرہ' خواہ فوجی حکمران برسرِ اقتدار ہوں یا مفاد پرست سیاست دان' اس کی بڑی وجہ موثر شورائی نظام کا فقدان' حکمرانوں کے ہاتھ میں آمرانہ اختیارات کا ارتکاز اور کسی موثر جواب دہی اور ضروری

احتساب کے نظام کی کمی ہے۔

بات ایوبی دور کی ہو' جس میں تین دریاؤں کے پانی سے دست برداری' بھارت چین جنگ کے موقع پر کشمیر پر پیش قدمی سے اجتناب' اور تاشقند میں بھارت کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے سانحے وقوع پذیر ہوئے یا ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی صاحبزادی کا دور ہو' نواز شریف کا زمانہ ہو یا یحییٰ اور ضیاالحق کا اور یا اس وقت کے جنرل پرویز مشرف کا--- جب بھی اختیارات کسی شخص واحد کی ذات میں مرکوز ہوئے ہیں اور وہ سیاہ و سفید کا مالک بنا' ایسی ہی خوف ناک اور بھیانک غلطیاں (blunders) رونما ہوئیں۔ ستم ظریفی ہے کہ ۱۰ دسمبر کے اقدام کے لیے خود چیف ایگزیکٹو کی اپنی بنائی ہوئی کابینہ تک سے مشورے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور نواز شریف کی رخصتی کے چار دن بعد اس واقعے پر کابینہ میں بحث ہوئی اور اس نے آمنا و صدقنا کی سند جاری کر دی! ہمارے ملک کی سیاست کا اصل المیہ ہی یہ ہے کہ فیصلہ کرنے والے ادارے موجود نہیں اور جو ادارے بنائے گئے ہیں وہ صرف وزن بیت کے لیے ہیں--- حقیقی اختیارات سے محروم! نواز شریف ہو یا بے نظیر' نہ ان کی جماعتوں میں کسی مشورے اور جواب دہی کا نظام ہے اور نہ کبھی ان کی کابینہ یا اسمبلیوں نے ایسا کوئی کردار ادا کیا۔

آج بھی بے نظیر بھارت سے دوستی' مشترک کرنسی' کشمیر میں جنگ بندی' مسام دار (porous) سرحدوں اور نہ معلوم کیا کیا باتیں کر رہی ہیں مگر ان کی پارٹی میں کوئی نہیں کہ اس کی زبان کو لگام دے یا اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ نواز شریف مسلم لیگ کو گھر کی لونڈی بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ جسے چاہیں نامزد کر دیں' جسے چاہے نکال دیں۔ کوئی نہیں جو ان کے اس رویے پر گرفت کر سکے اور ان کے دامن کو پکڑ کر ان سے پوچھ سکے۔ یہ تمام صورتیں آمریت کی شکلیں ہیں' انھیں جمہوریت سے کوئی نسبت نہیں۔ قوم کی ضرورت صرف فوجی اقتدار ہی سے نجات نہیں' آمریت کی ہر شکل سے بغاوت کر کے حقیقی جمہوریت' قانون کی بالادستی' مشاورت کے موثر نظام کا قیام' پالیسی سازی کے لیے افراد کی جگہ اداروں پر انحصار اور سب کے لیے جواب دہی کے نظام کا قیام ہے۔

آج پاکستان ہی نہیں' پوری مسلم دنیا کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ فوجی حکومت ہو یا ''جمہوری تماشا'' اقتدار کسی فردِ واحد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے اور اس کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ عبرت کے لیے مسئلہ فلسطین کے بگاڑنے میں مصر کے کردار پر ایک نظر ڈالیے۔ کیمپ ڈیوڈ جس نے شرق اوسط کی سیاست کا رخ بدل دیا اور مسئلہ فلسطین کو ہمیشہ کے لیے بگاڑ دیا' اس کا بڑا سبب فیصلوں کے لیے موثر شورائی نظام اور قومی جواب دہی کا فقدان ہے۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے وقت انورالسادات نے نہایت خود رائی اور

خودسری کا مظاہرہ کیا اور عقل کل بن کر اپنے تمام وزیروں اور مشیروں تک کو نظر انداز کر کے صدر کارٹر پر اعتماد کی ترنگ میں اس طرح معاملات نمٹائے کہ آج بھی فلسطین میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور فلسطین اتھارٹی اور عرب حکومتیں دم بخود ہیں۔ اس وقت کے مصری وزیر خارجہ عصمت کمال نے اپنی کتاب Camp David Accrod: A Testimony (مطبوعہ ۱۹۸۶ء) میں جو حالات بیان کیے ہیں وہ آنکھیں کھولنے والے اور خون کھولا دینے والے ہیں۔ افسوس کہ یہی کھیل ہے جو برابر کھیلا جا رہا ہے اور کم و بیش ہر ملک میں کھیلا جا رہا ہے۔ انور السادات کا ایک ہی مطالبہ تھا:

> براہ کرم' مجھ پر اعتماد کیجیے۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟

عصمت کمال لکھتا ہے کہ:

> اصل مسئلہ نہ اسرائیل کا غیر لچک دار رویہ تھا اور نہ امریکہ کا اسرائیل کے آگے موم کی ناک بن کر ہر معاملے میں سپر انداز ہو جانا (spineless surrender)۔ اصل مسئلہ تو صدر سادات خود تھے۔ انھوں نے صدر کارٹر کے آگے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے اور صدر کارٹر نے بیگن کے آگے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اب جو معاہدہ بھی ہوتا' مصر کے لیے' فلسطینیوں کے لیے اور کل عرب قوم کے لیے تباہ کن ہی ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں سادات کے عزائم اور رویے کی کیا توجیہ کروں۔ شاید انھوں نے اپنے آپ کو امریکہ سے اس درجے مضبوطی سے وابستہ کر لیا تھا کہ انھیں اس مرحلے پر اس سے باہر نکلنا مشکل محسوس ہوتا تھا (ص ۳۵۸-۳۵۹)۔

امریکہ پر انحصار' اس کے ہاتھوں میں کھلونا بن جانا اور فرد واحد کے ہاتھوں میں قوم کی قسمت کو دے دینا ساری خرابی کا اصل سبب تھا۔ اور یہی دو بلائیں ہیں جو مسلمان ملکوں کو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ گھر میں آمریت اور باہر کی قوتوں پر انحصار ہی ہمارا اصل روگ ہیں۔ ہم ہی نہیں' غیر بھی اس کمزوری کو دیکھ رہے ہیں اور خوب خوب اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ڈیوٹ ہرسٹ اور ارنے بی سن نے سادات کی سوانح عمری میں بڑی پتے کی بات کہی ہے جو بدقسمتی سے خود ہمارے حالات پر پوری طرح صادق آتی ہے:

> ایک فرد' ان اداروں کے بالمقابل جن کا وہ سربراہ ہو' جتنا زیادہ خود پالیسی بنائے گا اتنا ہی زیادہ ان کے بنانے میں اس کی ذاتی نفسیات ایک معروضی سیاسی حقیقت کے طور کارفرما ہوگی۔ سادات کسی طرح بھی دنیا کے سب سے زیادہ مطلق العنان حکمران نہ تھے لیکن ان کی سیاسی زندگی بہت ہی نمایاں طور پر اس کی مثال تھی کہ کس طرح سیاسی امور میں ذاتی رجحان کو غلبہ حاصل رہتا ہے۔ اور جب ذاتی رجحان اتنا ہی مخصوص طرح کا ہو جیسا کہ ان کا تھا' تو پالیسی کے نام پر کیا کیا بگاڑ رونما

ہوسکتے ہیں (ص ۴۵۴)۔

فردِ واحد کی حکمرانی اپنے اندر ایسے ایسے خطرات رکھتی ہے جو برسوں کی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل شدہ آزادی' عزت' دولت اور امکانات کو لمحوں میں غتربود کر سکتے ہیں!

دستور اور قانون کی حکمرانی' موثر شورائی نظام اور جمہوری اداروں کا وجود' جواب دہی اور پالیسی سازی کا اداراتی انتظام ہی اچھی حکمرانی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ فوجی حکومت ہو یا جمہوریت کے لبادے میں شخصی حکومت--- دونوں مطلوبہ نظام کی ضد ہیں۔ یہ نہ صرف ملک کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ خود فوج کی دفاعی صلاحیتوں کے لیے بھی سم قاتل ہے۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہو' حقیقی جمہوری نظام کی طرف مراجعت ہی میں ہماری نجات ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ قوم کی قسمت سے کھیلنے کا حق اور اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ یہ ملک کسی کی جاگیر نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک امانت ہے اور اس کے اصل امین اس ملک کے عوام ہیں۔ ہم اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاں ہماری فوجی اور سیاسی دونوں قیادتیں ناکام رہی ہیں وہیں عوام بھی اس ناکامی میں اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار نہیں دیے جاسکتے۔

انتخاب کے موقع پر اپنا کردار ادا نہ کرنا' یا برادری اور مفاد کی بنیاد پر غلط لوگوں کو برسرِ اقتدار آنے میں مدد دینا بھی ایک قومی جرم اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ آخری ذمہ داری عوام کی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور ملکی مفاد کے پیش نظر اچھی قیادت کو بروئے کار لائیں اور سیاسی شعبدہ بازوں سے بار بار دھوکا نہ کھائیں۔

غربت' تعلیم کی کمی اور جمہوری روایات کا فقدان راہ کے موانع ہیں لیکن جمہوری عمل کا کوئی متبادل نہیں۔ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اس عمل کے ذریعے بالآخر بہتر قیادت ابھرے گی اور عوام اپنا حقیقی کردار ادا کرنے کے لائق بن سکیں گے۔

ہمارے ملک کے حالات کی روشنی میں نظام انتخاب کی اصلاح اور آزاد انتخابی کمیشن کا قیام اس کے لیے ضروری ہیں۔ موجودہ حکومت سے اب احتساب کی کوئی توقع نہیں رہی۔ اگر یہ ملک کے اچھی شہرت رکھنے والے افراد کے مشورے سے ضروری انتخابی اصلاحات نافذ کر کے نئے انتخابات کا اہتمام کرے اور اقتدار قوم کی طرف لوٹا دے تو یہ اس کے لیے بھی بہتر ہے اور اس میں ملک و ملّت کے لیے بھی خیر ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں--- سوال اتنا ہے کہ یہ کام افہام و تفہیم اور خیر سگالی اور قومی مفاہمت کے ذریعے ہوتا ہے یا ایک نئی کش مکش اور عوام اور حکومت کے درمیان ٹکراؤ کے نتیجے میں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ حکومت دانائی کا راستہ

اختیار کرے گی اور اپنے اخلاقی جواز کو کھو دینے کے بعد اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش نہیں کرے گی، نوشتہ دیوار کو بروقت پڑھ لے گی اور اصلاح احوال کا وہ راستہ اختیار کرے گی جس سے ملک اس دلدل سے نکل آئے اور فوج کا بھی اعتماد باقی رہے تاکہ وہ دفاع وطن کے کام کے لیے یکسو ہو کر سرگرم ہو سکے۔ پاکستان کو اس دلدل سے نکالنے کا راستہ ہی یہ ہے کہ نظام حکومت ایسے ایمان دار اور باصلاحیت عوامی نمایندوں کے ہاتھوں میں آجائے جو خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہوں اور جو اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد کے تابع رکھ سکیں۔ سابق حکمرانوں کے حشر سے سبق سیکھیں اور اس سے عبرت پکڑیں کہ کس طرح دو دو بار وزیراعظم بننے والوں اور بڑے بڑے مینڈیٹ کا دعویٰ کرنے والوں کو ملک سے فرار کی راہ اختیار کرنی پڑی اور ملک کے عوام کس طرح ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ دونوں کا حال یہ ہے کہ نہ صرف ''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے'' بلکہ ملک کو ایسا بدحال کر کے نکلے کہ بہ ادنیٰ تصرف یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''بڑے بے آبرو کر کے ترے کوچے سے ہم نکلے''۔ لیکن نکلنے کا آبرومندانہ راستہ بھی موجود ہے۔ وہ محاذ آرائی کا نہیں بلکہ حق دار کو اس کا حق دینے کا راستہ ہے۔ فوجی قیادت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ فوج کا کام ملک پر حکمرانی کرنا نہیں، ملک وملت کا دفاع ہے۔ سیاست میں الجھ کر فوج نہ اچھی حکمرانی کا نمونہ پیش کر سکتی ہے کہ اس کی نہ یہ تربیت ہے، نہ صلاحیت اور نہ اس طرح یہ اپنی دفاع کی صلاحیت ہی کو باقی رکھ سکتی ہے۔ اگر فوج متنازع بن جائے یا اس کے لوگوں کو بھی بدعنوانی کا خون یا اقتدار کی چاٹ لگ جائے تو پھر وہ قوم کی امیدوں اور دعاؤں کا مرکز نہیں رہ سکتی۔ پھر تو وہ شکایتوں اور نفرتوں کا ہدف ہی بنتی جاتی ہے اور جس فوج پر اس کی اپنی قوم کا اعتماد نہ ہو، وہ دفاع کی خدمت کیسے انجام دے سکتی ہے۔ موجودہ قیادت اس حقیقت کو جتنی جلد تسلیم کر لے، اتنا ہی اس کے اور ملک کے لیے بہتر ہے۔

تحریک اسلامی اور ملک کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ عوام کو بیدار کریں، ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھیں، قوم کا خون چوسنے والوں کے چنگل سے قوم کو نکالیں اور اس ملک خداداد کو ایک اچھی اور ایمان دارانہ قیادت فراہم کریں جو اسے امت کے خوابوں اور تمناؤں کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد کو اپنی منزل بنا لے اور اقبال، قائداعظم اور ملت اسلامیہ ہند کے تصور کا پاکستان اس پاک دھرتی پر ایک زندہ حقیقت بن سکے۔ یہی امت مسلمہ کے لیے بھی ایک روشن مینار بن سکتا ہے۔ یہ صلاحیت اور یہ امکان آج بھی موجود ہے، اس کے لیے مسلسل جدوجہد اور اللہ پر بھروسا، خود اپنی قوم پر اعتماد، اپنے وسائل کا صحیح استعمال اور معاشرے کے تمام اچھے عناصر کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے

وہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے

جو اس کی طرف بڑھے۔

دُور بھاگنے والوں کے پیچھے دوڑنا

اللہ کا کام نہیں ہے۔

اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے

کہ کوئی اس نعمت دین کی صاف شاہ راہ کو پائے

اور کوئی اس پر خار کھائے

(تفہیم القرآن جلد ۴، ص ۴۹۳)

(خیرخواہ)

ذکر صدقے کی فضیلت کا

ملا علی قاری حنفی

ترجمہ: نواب صدیق حسن خاں

یہ تحریر کتاب روزمرہ اسلام (۱۳۰۶ھ) سے لی گئی ہے۔ یہ ملا علی قاری حنفی (م:۱۰۱۴ھ) کے مسائل سے ماخوذ ہے۔ ترجمہ بھوپال کے معروف عالم دین نواب صدیق حسن خاں (م:۱۳۰۷ھ) نے کیا ہے اور کہیں کہیں کچھ اضافہ کیا ہے۔ تدوین کرتے ہوئے زبان کی قدامت دور کی گئی ہے اور کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں (ادارہ)۔

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن آدم! اگر تو وہ مال، جو زیادہ ہے خرچ کرے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ سب سے پہلے اپنے اہل وعیال پر خرچ کر۔ اور اگر روک رکھے گا تو یہ تیرے لیے برا ہے۔ بقدر ضرورت تجھ کو ملامت نہیں (مسلم)۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے رسولؐ خدا! کون سا صدقہ بہت بڑا اجر رکھتا ہے؟ فرمایا: تو صدقہ دے، جب کہ تو تندرست و بخیل ہو، فقر سے ڈرتا اور غنا کی امید رکھتا ہو، اور اتنی دیر نہ کر کہ جان گلے میں پہنچے تب تو کہے کہ فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا۔ وہ تو اس کا ہو ہی چکا ہے (متفق علیہ)۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کعبہ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ میں آیا، مجھے دیکھ کر فرمایا: قسم ہے رب کعبہ کی! وہی زیاں کار ہیں۔ میں نے کہا: میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، وہ کون ہیں؟ فرمایا: یہی بڑے مال دار، مگر جس نے دیا دائیں اور بائیں سے، سامنے اور پیچھے سے۔ اور ایسے لوگ تھوڑے ہیں (متفق علیہ)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سخی قریب ہے اللہ سے، قریب ہے جنت سے، قریب ہے لوگوں سے، دور ہے آگ سے۔ بخیل دور ہے اللہ سے، دور ہے جنت سے، دور ہے لوگوں سے، قریب ہے آگ سے۔ البتہ جاہل سخی دوست تر ہے اللہ کو عابد بخیل سے (ترمذی)۔ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت میں ہے کہ اگر آدمی اپنی حیات میں ایک درہم صدقہ دے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ ۱۰۰ درہم صدقہ دے موت کے وقت (ابوداؤد)۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہر دن، جب کہ بندے صبح کرتے ہیں دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک کہتا

ہے تا کہ انسان یہاں اس کے دیے ہوئے سروسامان اور اس کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر اپنی اصلی قدر و قیمت کا اظہار کرے۔ اس تصور کی رو سے دنیا کوئی چراگاہ یا رزم گاہ نہیں ہے' بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ جس چیز کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں' وہ دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے پرچے کرنے کے لیے ہم کو دیا گیا ہے' اور امتحان کے پرچے بے شمار ہیں۔ ماں باپ' اولاد' بیوی' شوہر' بھائی بند' رشتے دار' دوست' ہمسائے' قوم' وطن اور پوری انسانیت جس کے ساتھ طرح طرح کے تعلقات و روابط میں انسان بندھا ہوا ہے' ان میں سے ہر ایک امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اپنی معاش کے سلسلے میں اور جن جن طریقوں سے بھی انسان کام کرتا ہے اور پھر اس کمائی کو جس جس طرح خرچ کرتا ہے' یہ سب بھی امتحان ہی کے مختلف پرچے ہیں۔ اسی طرح جتنی قوتیں اور قابلیتیں اللہ نے اس کو دی ہیں' جو جو خواہشیں اور میلانات اور جذبات اس میں رکھے ہیں' جن جن ذرائع اور وسائل سے کام لینے کی اس کو قدرت عطا کی ہے' ان سب کی اصل حیثیت بھی امتحان کے پرچوں ہی کی ہے۔ اور سب سے بڑا پرچہ اس مضمون کا ہے کہ اپنے اس خالق کے ساتھ انسان کیا رویہ اختیار کرتا ہے جس کی دنیا میں وہ رہتا ہے' جس کی دی ہوئی قوتوں اور طاقتوں سے وہ کام لیتا ہے' اور جس کے بخشے ہوئے سروسامان کو وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر امتحان ہے' جس کی لپیٹ میں زندگی کا ہر پہلو آیا ہوا ہے اور ہمہ وقتی امتحان ہے جس کا سلسلہ ہوش سنبھالنے کے وقت سے موت کی آخری ساعت تک جاری رہتا ہے۔

اس امتحان گاہ میں اصلی اہمیت اس چیز کی نہیں ہے کہ آپ کس مقام پر' کس حیثیت میں امتحان دے رہے ہیں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو شخص یہاں مزدور کی حیثیت سے اٹھ کر ایک بڑا کارخانہ دار' یا رعیت کے مقام سے بلند ہو کر ایک بڑا فرماں روا بن گیا ہے' اس نے درحقیقت کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے بلکہ امتحان کے بہت سے زاید پرچے اس نے لے لیے ہیں اور پہلے کی بہ نسبت وہ بہت زیادہ سخت پرچے لے کر بیٹھ گیا ہے' جہاں نمبر زیادہ پانے کے جتنے امکانات ہیں' اتنے ہی زیادہ ناکامی کے خطرات بھی ہیں۔

یہ امتحانی تصورِ حیات جس شخص کا بھی ہو' اس کا معیار کامیابی و ناکامی لازماً دوسرے تصورات حیات رکھنے والوں کے معیار سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس کے نزدیک اصل کامیابی خدا کے اس امتحان میں ایک بندۂ وفادار و شکر گزار ثابت ہونا ہے۔ ایک ایسا بندہ ثابت ہونا ہے جس نے خدا کے اور بندوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک سمجھے اور ادا کیے ہوں۔ جس نے دل اور نگاہ' کان اور زبان' پیٹ اور جنسی قوتوں کو بالکل پاک رکھا ہو۔ جس کے ہاتھوں نے کسی پر ظلم نہ کیا ہو' جس کے قدم بدی کی راہ پر نہ چلے ہوں' جس نے کم کمایا ہو یا زیادہ' مگر جو کچھ بھی کمایا ہو' حق اور راستی کے ساتھ کمایا اور جائز راستوں میں خرچ کیا ہو۔ جو امانتوں کا محافظ' قول و قرار میں سچا اور عہد و پیمان میں راسخ رہا ہو۔ جو بھلائی کا دوست اور برائی کا دشمن ثابت ہوا ہو۔ جسے اس کے خدا نے جس

حیثیت میں بھی رکھا ہو وہاں اس نے اپنی ذمے داریوں کو کماحقہ سمجھا اور ادا کیا ہو۔ جس کا یہ حال نہ رہا ہو کہ بقول ظفر:

ع جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یہ کامیابی جس کو نصیب ہوگئی' وہ بہرحال فائز المرام ہے' خواہ دنیا میں وہ نانِ جویں تک کو محتاج رہا ہو اور اس کا کوئی کارنامہ تاریخ کے صفحات پر ثبت نہ ہو۔ اس کے برعکس جو اس کامیابی سے محروم رہ گیا' وہ سخت نامراد ہے خواہ وہ دنیا کے سرمایہ داروں کی صفِ اوّل میں پیشوائی کا مقام حاصل کرگیا ہو' یا فاتحین عالم کا سرخیل ہی کیوں نہ ہو (۲ جولائی ۱۹۵۸ء)' (کامیاب زندگی کا تصور' مرتبہ: پروفیسر انور دل' مکتبہ جدید' لاہور' مارچ ۱۹۶۴ء' ص ۲۳-۲۷)۔

کامیاب زندگی کا تصور

کامیاب زندگی کا کوئی تصور قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود زندگی کا کوئی تصور قائم کر لیا جائے' کیونکہ اسی پر کامیابی کا تصور مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک تصورِ حیات کے لحاظ سے ایک زندگی انتہائی کامیاب قرار پاتی ہے' تو دوسرے تصور حیات کے لحاظ سے وہی زندگی انتہائی ناکام ٹھہرتی ہے۔ دنیا کو ایک چراگاہ یا خوانِ یغما سمجھیے تو وہ شخص بہت کامیاب ہے جو اس تھوڑی سی مہلتِ عمر میں خوب عیش کر لے' اور وہ بڑا ہی نامراد ہے جو نفس و جسم کے ابتدائی مطالبات بھی اچھی طرح پورے نہ کر سکے۔ دنیا کو ایک رزم گاہ سمجھیے تو کامیاب آدمی وہ ہے جو اس کش مکش کے میدان میں سب کو روندتا کچلتا آگے بڑھتا چلا جائے' یہاں تک کہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں اس کے جیتے جی کوئی حریف اس کی آرزوؤں کی تکمیل میں مزاحم ہونے والا نہ رہ جائے اور اس کے برعکس وہ آدمی بالکل ہی ناکام بلکہ نکما ہے جو اپنی اغراض کے لیے کسی ایک بندۂ خدا سے بھی چھین جھپٹ نہ کرے اور سفر حیات میں کبھی دو ہمراہیوں کو بھی کہنی مار کر آگے نہ نکلے۔ لیکن اگر آپ کا تصورِ حیات ان تصورات سے مختلف ہو تو کامیابی و ناکامی کے متعلق بھی آپ کا تصور ان سے مختلف ہو جائے گا۔ اتنا مختلف کہ آپ ان لوگوں کو سخت ناکام و نامراد سمجھیں گے جو ان تصورات کے لحاظ سے بڑے کامیاب ہیں' اور ایسے لوگوں کو انتہائی کامیاب قرار دیں گے جو ان کے لحاظ سے قطعی ناکام ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کامیابی و ناکامی کا کوئی ایک متعین معیار نہیں ہے جو دنیا بھر میں مسلّم ہو' بلکہ مختلف لوگوں کی نگاہ میں اس کے مختلف معیار ہیں اور ان معیاروں کے متعین کرنے میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو' اور اس دنیا کو جس میں وہ رہتا ہے' اور اس مہلت عمل کو جو اسے یہاں حاصل ہے' کیا سمجھتا ہے؟

طولِ کلام سے بچتے ہوئے میں اختصار کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ ایک سچے مسلمان کی نگاہ میں فلاح و خسران کا حقیقی معیار کیا ہے۔ یہ معیار اسلام نے پیش کیا ہے اور ہمیشہ سے اہل ایمان اسی کے لحاظ سے رائے قائم کرتے رہے ہیں کہ فائز و کامران کون ہے اور خائب و خاسر کون۔

زندگی کا جو تصور اسلام ہمیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا

ہے: اللھم اعط منفقا خلفا۔ دوسرا کہتا ہے: اللھم اعط ممسکا تلفا (متفق علیه)' یعنی ایک سخی کو دعا دیتا ہے' دوسرا بخیل کے لیے بد دعا کرتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: قال اللّٰہ تعالٰی انفق یا ابن آدم انفق علیك (متفق علیه)۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دو خصلتیں مومن میں جمع نہیں ہوتیں' بخل و بد خلقی (ترمذی)۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے یوں روایت کیا ہے کہ نہ جائے گا جنت میں مکار و بخیل اور احسان جتانے والا (ترمذی)۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آدمی میں بدترین اشیا شح ہالع اور جبن خالع ہیں' یعنی شدید بخل اور سخت کم ہمتی (ابوداؤد)۔ حدیث ابوہریرہؓ میں ذکر ہے کہ ایک شخص نے اپنا صدقہ ایک بار چور کو' دوسری بار زانیہ کو' اور تیسری بار آسودہ آدمی کو ناواقفیت سے دے دیا۔ جب لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو اس نے کہا: اللھم لك الحمد علی سارق وزانية وغني ۔ اس سے کہا گیا کہ تیرا صدقہ چور پر ہوا شاید وہ چوری سے اور زانیہ زنا سے باز رہے' اور غنی عبرت پکڑے اور خود بھی خرچ کرے (متفق علیه)۔ معلوم ہوا کہ جو صدقہ اخلاص نیت سے دیا جاتا ہے اگر غلطی سے وہ کسی غیر مستحق کو پہنچتا ہے تو بھی متصدق کو اجر ملتا ہے اور غیر مستحق کے حق میں بھی کبھی نافع ہو جاتا ہے۔

ایک طویل حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ ایک کوڑھی' گنجے اور اندھے کا قصہ بیان کرتے ہیں جن کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ اللہ نے ان کا امتحان لیا۔ ان کی خواہش کے مطابق کوڑھی کو اچھا کر کے خوب صورت خوش رنگ بنا دیا گیا اور اس کو اونٹ یا گائے عطا کی گئی۔ اسی طرح گنجے کو عمدہ بال اور گائے بخشی اور اندھے کو آنکھیں اور بکریاں دیں یہاں تک کہ ہر ایک کے مال سے ایک جنگل بھر گیا۔ پھر وہی فرشتہ جس نے اپنا ہاتھ ان پر پھیرا تھا اور یہ اچھے ہو گئے تھے ان میں سے ہر ایک کے پاس شکل اول میں آ کر سائل ہوا اور کہا جس اللہ نے تجھ کو ایسا کر دیا ہے اس کے نام پر کچھ مجھ کو بھی دے کہ میں مسکین اور مسافر ہوں اور گھر تک نہیں پہنچ سکتا۔ کوڑھی نے کہا حقوق بہت ہیں۔ اس نے کہا میں تجھ کو پہچانتا ہوں تو ابرص اور فقیر تھا' اللہ نے تجھ کو یہ مال دیا۔ کہا: یہ مال تو پشت ہا پشت سے مجھ کو ملا ہے۔ اس نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھ کو پھر ویسا ہی کر دے۔ اسی طرح گنجے سے برتاؤ ہوا اور اس کو بھی بد دعا دی۔ پھر اندھے کے پاس آ کر وہی گفتگو کی۔ اس نے کہا: میں اندھا تھا' اللہ نے مجھ کو بینا کر دیا' تو جتنا چاہے لے جا۔ آج میں تجھ کو کسی شے سے نہ روکوں گا۔ فرشتے نے کہا تو اپنا مال اپنے پاس رکھ: فانما ابتلیتم فقد رضی عنك وسخط علی صاحبیك (متفق علیه)' یعنی تمھارا امتحان ہوا۔ تجھ سے اللہ راضی رہا اور ان دونوں سے خفا ہوا۔

حضرت اُمِ مجیدؓ نے حضرتؐ سے کہا کہ مسکین میرے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔ میں شرم کرتی ہوں

کہ گھر میں اس کے دینے کو کچھ نہیں پاتی۔ فرمایا: اس کے ہاتھ میں دے اگرچہ ایک سم سوختہ ہو (مسند احمد)۔ معلوم ہوا کہ گدا کو خالی ہاتھ نہ پھیرے۔ کچھ نہ کچھ دے دے اگرچہ بے حقیقت وحقیر ویسیر چیز ہو۔ سلف ہر روز صدقہ دیتے تھے، اگرچہ ایک گرہ پیاز کی یا ایک ڈلی نمک کی ہوتی۔ کوئی دن صدقہ سے خالی نہ چھوڑتے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے: کیا میں تم کو بدتر درجے والے لوگوں کی خبر نہ دوں؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: الذی یسئل باللّٰہ ولا یعطی بہ (مسند احمد)، یعنی جس سے اللہ کا نام لے کر مانگیں اور اس کو کچھ نہ دیا جائے۔ اس زمانے میں یہ بہت ہوتا ہے کہ سائل باللہ کو نہیں دیتے۔ کچھ نہ کچھ تو دینا چاہیے۔ سائلین نے بھی یہ عادت بنا لی ہے کہ جب بھی مانگتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ للہ فی اللہ برائے خدا ہم کو دو، اگرچہ بسبب موجود ہونے طعام صبح و شام، ان پر سوال کرنا حرام ہوتا ہے۔ آپ بھی ڈوبتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بدترین خلق بناتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے [انھوں نے] فرمایا: صدقہ دینے میں جلدی کرو، بلا اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ مطلب یہ ٹھیرا کہ صدقہ ردّ بلا ہوتا ہے۔ وللّٰہ الحمد۔ تجربے نے اس کی شہادت دی ہے۔ دوسری دافع بلا چیز دعا ہے، جب کہ غفلت سے نہ ہو۔

صدقہ کے فضائل

حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ جس نے صدقہ دیا برابر ایک کھجور کے پاک کمائی سے، اور اللہ قبول نہیں کرتا مگر پاک کمائی، تو لیتا ہے اللہ اس کو اپنے دست راست سے۔ پھر پالتا ہے اس کو واسطے صاحب صدقہ کے جس طرح کہ پالتا ہے کوئی تم میں بچھڑے کو۔ یہاں تک کہ ہو جاتا ہے برابر پہاڑ کے (متفق علیہ)۔ ایک دوسری روایت اس طرح سے ہے کہ جس نے راہ خدا میں خرچ کیا ایک جوڑا کسی شے کا اشیا میں سے، وہ بلایا جائے گا ابواب جنت سے۔ ہر عمل صالح کا ایک دروازہ ہے جس پر جیسا عمل غالب ہوگا وہ اسی عمل کے دروازے سے بلایا جائے گا، اور جس پر سب اعمال صالحہ یکساں غالب ہوں گے وہ سب ابواب سے پکارا جائے گا۔ وللّٰہ الحمد۔

حضرت جابرؓ اور حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ہر معروف صدقہ ہے (متفق علیہ)۔ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ کسی معروف یعنی نیکی کو حقیر نہ جان، اگرچہ ملے تو اپنے بھائی سے بہ کشادہ روی (مسلم)۔ یعنی یہ بھی ایک نیکی وصدقہ ہے۔ ''معروف'' کہتے ہیں ہر طاعت خدا اور احسان الی الناس کو۔ منجملہ معروف کے ایک پہلو اپنے اہل وغیر ہم کے ساتھ حسن صحبت ہے اور لوگوں سے ہشاش بشاش ملنا۔

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ ہر مسلمان پر صدقہ ہے۔ کہا کہ اگر نہ پائے۔ فرمایا: اپنے ہاتھوں سے کام کرے، یعنی کچھ کمائے اپنی جان کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے۔ کہا کہ اگر نہ کر سکے یا نہ کرے؟ فرمایا: کسی حاجت مند کی مدد کرے۔ کہا کہ اگر یہ بھی نہ کرے؟ فرمایا: خیر کا حکم کرے۔ کہا کہ یہ بھی اگر نہ

کرے؟ فرمایا: شر سے باز رہے کہ یہ بھی صدقہ ہے (متفق علیہ) ۔اللہ کے احسان کی کچھ نہایت نہیں ہے۔ مسلمان کی ہر بات معروف ہے۔ اس کا ہر کام ہمراہ نیت صالحہ کے صدقہ ٹھیرتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہر جوڑ پر آدمی کے ایک صدقہ ہے۔ ہر دن جس میں سورج نکلتا ہے دو شخصوں کے درمیان عدل کرنا صدقہ ہے۔ کسی کے جانور پر بار لادنے میں مدد کرنا یا متاع کا اٹھا دینا صدقہ ہے۔ اچھی بات کہنا صدقہ ہے۔ نماز کے لیے ہر قدم صدقہ ہے۔ ایذا کی چیز دور کرنا صدقہ ہے (متفق علیہ)۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ تمھارا جماع کرنا صدقہ ہے۔ پوچھا گیا کہ وہ تو جنسی تسکین کرتا ہے اور اس میں اس کو اجر ملتا ہے؟ فرمایا: اگر وہ اس شہوت کو حرام میں صرف کرتا تو کچھ گناہ ہوتا۔ جب اس کو حلال میں صرف کیا تو اب اس کے لیے اجر ہوگا (مسلم)۔ یعنی اس کے ضمن میں تحصین فرج اور ادائے حق زوجہ و طلب ولد صالح ہے اور یہ امور بذاتہا صدقات و قربات ہیں۔ حضرت انسؓ کی روایت یہ ہے کہ نہیں لگاتا کوئی مسلمان کوئی درخت یا کرتا ہے کھیتی' پھر اس سے انسان یا پرندے یا بہائم کچھ کھاتے ہیں لیکن یہ اس کے لیے صدقہ ہوتے ہیں (متفق علیہ) ۔حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ جو کچھ اس میں سے چوری ہو گیا وہ بھی صدقہ ہے۔ غرض یہ ساری خوبی اسلام کی ہے کہ مسلمان کا ہر فعل و عمل عبادت ہوتا ہے ورنہ کافر کی کوئی نیکی بھی کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو' کچھ نفع اس کو نہیں دیتی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کہ ایک گناہ گار عورت محض اس وجہ سے بخش دی گئی کہ اس کا گزر ایک کتے پر ہوا تھا جو برلب چاہ مارے پیاس کے زبان نکالے مرا جاتا تھا۔ اس عورت نے اپنا موزہ اتار کر اور اپنی اوڑھنی میں باندھ کر پانی نکالا اور اس کو پلایا۔ اللہ نے اس بات پر اس کو بخش دیا۔ صحابہؓ نے کہا کہ کیا ہم کو بہائم میں بھی اجر ملتا ہے؟ فرمایا: ہر جگر تر میں اجر ہے (متفق علیہ)۔ جگر تر سے مراد حیوان ہے۔ یعنی ہر جانور کے کھلانے پلانے میں اجر ملتا ہے مگر وہ جانور جس کے قتل کا حکم ہے جیسے سانپ' بچھو۔

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے فرمایا: عذاب کی گئی ایک عورت ایک بلی کے پیچھے کہ اس کو باندھ کر رکھا یہاں تک کہ بھوک سے مر گئی۔ نہ اس کو کھلایا اور نہ چھوڑ دیا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھاتی (متفق علیہ)۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرد کا گزر ایک شاخ درخت پر ہوا جو راہ میں تھی۔ اس نے کہا میں اس شاخ کو مسلمانوں کی راہ سے الگ کر دوں گا تاکہ یہ ان کو ایذا نہ دے۔ وہ شخص جنت میں داخل کیا گیا (متفق علیہ)۔ ظاہر حدیث یہ ہے کہ مجرد نیت پر اس کی مغفرت ہوئی۔ مگر انھوں نے ایک دوسری روایت یوں بیان کی کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جنت میں لوٹ پوٹ رہا ہے بسبب ایک درخت کے جس کو اس نے راہ سے کاٹ ڈالا تھا کہ وہ لوگوں کو ایذا دیتا تھا (مسلم)۔

ان حدیثوں سے اللہ تعالیٰ کی نکتہ نوازی اور نکتہ چینی ثابت ہوتی ہے کہ چاہے ادنیٰ بات پر پکڑ لے اور چاہے ادنیٰ بات پر بخش دے۔ لیکن پکڑ گناہ پر ہوتی ہے' گو صغیرہ ہو۔ اور مغفرت چلی جو ہے' ذرا سی خیر پر بھی

بخش دیتا ہے۔ حضرت ابو برزہؓ نے حضرتؐ سے کہا تھا کہ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس سے مجھے نفع ہو۔ فرمایا: دور کر ایذا کی چیز کو مسلمانوں کی راہ سے (مسلم)۔ اس سے معلوم ہوا کہ راہ کا سنگ وخار وغیرہ اشیا موذیہ سے صاف کرنا اور اہل اسلام کے آرام کے واسطے سڑکوں کا بنانا منجملہ اسباب مغفرت کے ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صدقہ رب کے غضب کو بجھا دیتا ہے اور بری موت کو دور کرتا ہے (ترمذی)۔ بری موت سے مراد وہ حالت بد ہے جو مرنے کے وقت ہوتی ہے، عاذنا اللّٰہ منه۔ یہ نفع صدقے کا کہ سوء خاتمہ کا دافع ہے، افضل منافع ہے۔ اگر صدقہ دینے میں کوئی فضیلت ومنفعت نہ ہوتی اور صرف یہی دفع میتة السوء ہوتا تو کفایت کرتا۔

حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبی کریمؐ سے عرض کیا: اے رسولؐ خدا! سعد کی ماں کا انتقال ہو گیا، کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: پانی۔ انھوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا: ھٰذہ لِاُمِّ سعد (ابوداؤد)۔ معلوم ہوا کہ مردے کی طرف سے صدقہ کرنا درست ہے اور بہتر صدقہ پانی ہے۔ اس لیے کہ اس کا نفع امور دنیا و دین میں عام ہے خواہ کنواں ہو یا تالاب یا نہر یا حوض یا سبیل یا سقایہ۔ حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ جس مسلمان نے کسی ننگے مسلمان کو کپڑا پہنایا، اللہ اس کو جنت کا لباس سبز پہنائے گا اور جس مسلمان نے کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلایا، اللہ اس کو جنت کے پھل کھلائے گا۔ اور جس مسلمان نے کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلایا، اللہ اس کو شراب مہر زدہ پلائے گا (ابوداؤد)۔ معلوم ہوا کہ ننگے کو پہنانا، بھوکے کو کھلانا، پیاسے کو پلانا افضل صدقات وانفع خیرات واکرم مبرات ہے۔ شراب مہر زدہ سے مراد بادۂ ناب ہے۔ نفیس شے کو بوتل میں بند کر کے مہر لگا دیتے ہیں، اور وہ خاص لوگوں کو ملتی ہے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ روایت کرتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: ان فی المال حقا سوی الزکوٰة، پھر یہ آیت پڑھی: لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب (ترمذی)۔ مال کا حق یہ ہے کہ سائل کو محروم نہ پھیرے، اور قرض خواہ کو اور متاع بیت کو مانگنے والے سے نہ روکے جیسے دیگ یا رکابی اور ایسی دوسری اشیا۔ آیت سے استشہاد یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً ان وجوہ کو ذکر کیا، پھر ذکر کا دینا فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔ سو ایک حق تو وہ ہوتا ہے جو اللہ نے بندے پر واجب کیا ہے، اور دوسرا حق وہ ہے جو خود بندہ اپنی جان پر لازم کر لیتا ہے تاکہ وہ صفت بخل سے محفوظ رہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے کہ جس نے اپنے عیال کے نفقہ میں توسیع کی عاشورے کے دن، وسعت دیتا ہے اللہ اس کو باقی سال میں۔ حضرت ابوذرؓ نے حضرتؐ سے پوچھا تھا کہ صدقہ کیا ہے یعنی اس کا ثواب کتنا ہے؟ فرمایا: اضعاف مضاعف ہے، اور اللہ کے نزدیک مزید ہے (مسند احمد)۔

(تدوین: امجد عباسی)

کام کیسے کریں؟ وقت کیسے بچائیں؟

آپ کا وقت --- **آپ** ہی کے لیے ہے --- لیکن اکثر ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ کام رہ جاتے ہیں --- وقت گزر جاتا ہے --- مقاصد پیچھے چلے جاتے ہیں، دیگر تقاضے سامنے آجاتے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ وقت کا صحیح استعمال کیسے ممکن ہے

◎ ترجیحات قائم کریں۔ اوّل کام اوّل وقت کریں

◎ معلومات کے تبادلے کے وقت بات واضح اور قطعی کریں

◎ اپنی ذمہ داری اور اختیار کا مسلسل تعین کرتے رہیں

◎ کام سپرد کرتے وقت احتیاط سے کام لیں۔ حسب توقع کروالینا اکثر اوقات خود کرلینے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے

◎ اپنے وقت کے ایک حصے کو دوسروں کے تسلط سے آزاد رکھیں تاکہ آپ کی ذمہ داریوں کی تکمیل بھی ہوسکے

◎ مشغولیات میں شرکت کا فیصلہ دل چسپی کے بجائے اہمیت اور ضرورت کی بنیاد پر کریں

◎ کسی کام کو ادھورا نہ چھوڑیں۔ بعد میں زیادہ وسائل اور وقت درکار ہوگا

◎ سالانہ/ ششماہی/ ماہانہ/ ہفتہ وار/ روزانہ اہداف مقرر کر کے کاموں کا جائزہ لیتے رہیں

◎ اگر کبھی نہ کہنا ضروری ہوجائے تو اعتماد سے کہیں

اور ———

میٹنگ اور کاغذی کارروائی! اکثر ان کے ہجوم میں کام غائب ہوجاتا ہے ---

◎ اصل توجہ نتائج پر رکھیں

سنابل العلم

خدمت و محبت

داعیانہ کردار کا ایک اہم پہلو

خرم مرادؒ

اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے، انسان کے ساتھ تعلق کا موضوع فطری طور پر سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس تعلق کی روح محبت و خدمت ہے۔

انسان کے ساتھ تعلق دینی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ مگر آج کے مروجہ دین میں بھی، اور ان کے ہاں بھی جو پورے دین کی اقامت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں، اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے۔ عام مروجہ دین کا جو ظہور عملی زندگی میں نظر آتا ہے، اس میں تو دینی زندگی کو مراسم عبودیت، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس قسم کے دوسرے مراسم تک محدود کر دیا گیا ہے۔ جہاں مکمل دین کو قائم کرنے کا دعویٰ اور مقصد ہے، اور اس میں جہاد کو شامل کیا گیا ہے، وہاں اس کے باوجود انسان کے ساتھ تعلق کی جو اہمیت دین میں ہے، وہ اہمیت اسے حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دین پوری زندگی کا نظام ہے --- اور یہی وہ اعلان ہے جس پر اقامت دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک قائم ہوئی ہے--- تو ہم کو یہ جاننا چاہیے کہ انسان کی زندگی تقریباً ساری کی ساری انسانی روابط کا مجموعہ ہے۔ انسان دنیا میں پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک خاندان بناتے ہیں۔ انسان کا بچہ اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے اور اس کی پرورش ہو سکتی ہے، جب دو انسان مل کر اس کی خدمت کریں اور اس کو زندگی کا سامان بہم پہنچائیں۔ اس کے بعد بھی، اس کی پوری زندگی دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات سے عبارت ہے۔ ہم اقامت دین کے ضمن میں معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور اس قسم کے دیگر نظاموں کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ سب کے سب نظام بھی انسان اور انسان کے تعلق، ان کے درمیان روابط، اور ان کے درمیان خیالات اور مال اور اشیا

اور دوسری چیزوں کے تبادلے سے وجود میں آتے ہیں۔

اس لحاظ سے، اگر پورے دین کی اقامت مقصود ہو، تو جہاں یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل میں، اور اپنی ذاتی زندگی میں، ہر جگہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے روابط اور تعلقات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق قائم ہوں۔ ایک لحاظ سے آپ غور کریں تو اقامت دین کی ساری جدوجہد بھی دراصل انسان کی خدمت و محبت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ اقامت دین کی جدوجہد اس لیے ہے کہ اس دنیا میں انسان عدل و انصاف کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، ان کی زندگی سکون سے اور رحمت سے بھر جائے، وہ یہاں آسایش کے ساتھ اور فراخی کے ساتھ زندگی گزار سکیں، اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکیں۔ یہی بات نبی کریمؐ نے اس طرح فرمائی ہے: میری اور تمھاری مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے آگ جلائی اور سارا ماحول روشن ہو گیا، تو پرندے اور کیڑے جو آگ میں گرتے ہیں وہ آگ میں گرنے لگے، اور میں ان کو پکڑ پکڑ کر بچا رہا ہوں۔ اسی طرح میں تمھاری کمریں پکڑ پکڑ کر کہتا ہوں کہ اللہ کے بندو آگ سے بچو! اور تم ہو کہ مجھے نظرانداز کر کے آگ میں گرے جا رہے ہو۔

جو داعی بھی دین کی اقامت اور دعوت اور شہادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس کی بنیاد انسان کا یہی درد اور سوز ہے۔ اسی سے دعوت کے اندر وہ کیف اور وہ اثر اور وہ کشش پیدا ہوتی ہے جس سے انسان اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ خشک دعوت انسانوں کے دلوں پر کبھی بھی اثر نہیں کرتی جب تک اس کے اندر ان کے لیے محبت اور سوز و درد نہ ہو۔ قرآن مجید نے ہر نبی کے اسوۂ دعوت میں گمراہ سے گمراہ قوموں کے لیے بھی نبی کا سوز و درد اور ان کے لیے محبت رسولؐ کو واضح کیا ہے۔ داعی کی حیثیت سے اور اقامت دین کے مجاہد کی حیثیت سے، انسان کی خدمت اور دنیا کے اندر اس کو عدل و انصاف سے بہرہ ور کرنے کے لیے اور آخرت میں اس کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے جو تڑپ ہونا چاہیے، وہی دراصل خدمت کی بنیاد بنتی ہے، اور نہ ہو تو اس کو بننا چاہیے۔

دین کی اقامت ان کے لیے نہیں ہے جو دنیا میں اپنی بلندی، اپنا غلبہ اور اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ اہل ایمان تو وہ ہیں جو اس بات سے بالا ہوتے ہیں اور انسانوں کے خادم بن کر ان کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے تو کہا ہے کہ جو زمین میں اپنی بڑائی اور اپنا غلبہ و استیلا نہیں چاہتے، اور نہ بگاڑ چاہتے ہیں، ہم نے ان کے لیے آخرت مخصوص کر رکھی ہے۔ ہمارے دور اول کے حکمرانوں نے یہی بات ثابت کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ جب کسی عامل نے انھیں لکھا کہ آپ نے جزیہ معاف کر دیا تو بیت المال خالی ہو جائے گا۔ اس پر انھوں نے کہا: اللہ نے اپنے نبی کو ٹیکس کلکٹر بنا کر نہیں بھیجا تھا بلکہ

ہادی بنا کر بھیجا تھا۔ اگر خزانہ خالی ہو جائے تو اس میں جھاڑو دے کر تالا ڈال دو۔ ہم حکومت اس لیے نہیں کر رہے کہ لوگوں سے ٹیکس جمع کریں، بلکہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کو صحیح راہ پر لگانا ہے۔ دراصل اقامت دین، جہاد اور دعوت کے اندر یہی مقصد اور نظریہ کارفرما ہے۔ انسان سے ہمدردی، اس کے لیے سوز و محبت، اس کی گمراہی پر پریشانی، اور اپنی ذات کے لیے اللہ کی رضا اور اس کی جنت کا حصول، اس کا اصل محرک ہے۔

قرآن مجید نے روابط کے اس نظام کو اللہ کی سب سے نمایاں صفت یعنی رحمٰن کی صفت پر قائم کیا ہے۔ مختلف احادیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے اور نبی کریمؐ کا اسوہ بھی رحمت کا مظہر ہے۔ وہ مومنین کے لیے رؤف و رحیم ہیں، سراپا شفقت اور سراپا رحمت اور سارے عالمین کے لیے بھی وہ رحمت ہیں۔

نبی کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کی رحمت، اور ایک انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت کے تعلق کو، مختلف احادیث کے اندر مختلف پیرائے میں اور مختلف اسلوب میں بیان کیا ہے۔ مثلاً من لا یرحم لا یرحم، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا--- یعنی جو لوگوں پر رحم نہیں کرتے، ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ نہیں کرتے، ان پر اللہ بھی رحم نہیں کرے گا۔ جو لوگوں پر رحمت کرنے والے ہیں، ان کے اوپر رحمٰن رحم کرے گا۔ ان لوگوں پر رحم کرو جو زمین میں ہیں، جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔ اس طرح سے ایک نہیں بے شمار احادیث ہیں جن میں یہ فرمایا ہے کہ انسانی روابط کو اللہ کی رحمٰن و رحیم ہونے کی صفت کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے۔ مومنین کے لیے قرآن نے خود واضح کر دیا: رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸:۲۹) کہ وہ ایک دوسرے کے لیے سراپا رحمت ہیں۔ مسلمان، مسلمانوں کی جماعت، مسلمانوں کی امت ایک دوسرے کے لیے اور بنی نوع انسان کے لیے بھی سراپا رحمت ہیں۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ الخلق عیال اللہ، یعنی اللہ کی مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ اور اس کا خاندان ہے۔ اور اللہ کو اپنے کنبے اور خاندان میں وہی فرد سب سے بڑھ کر محبوب ہے جو اس کے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کرے، احسان کرے اور نیکی کرے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ ہو۔

رحمت تعلق کا بنیادی سانچہ ہے۔ اگر ہم اس کو مزید تقسیم کرنا چاہیں تو دو اصولوں کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان، انسانوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے، ان کی خدمت کرے، ان کی بھلائی کرے، ان کے کام آئے، ان کی حاجتیں پوری کرے، ان کے غم اور افکار کو دور کرے اور ان کے رنج کو ہلکا کرے۔ یہ مثبت پہلو ہے، دوسرا منفی پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایک انسان دوسرے انسان کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچائے۔ انسانوں کے ساتھ تعلق کے جو بھی پہلو آئیں گے وہ اسی مثبت اور منفی، ان دو پہلوؤں سے مل کر

عبارت ہوں گے۔

کسی کا حق مارنا، اس کو ایذا پہنچانا ہے۔ اسی لیے کسی کا حق مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر آپ شریعت کی تعلیمات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ شریعت کی بہت چھوٹی چھوٹی تعلیمات بھی اسی اصول پر مبنی ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو تکلیف پہنچانے کا ذریعہ نہ بنے۔ مثلاً اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی چیز بغیر اجازت کے لی جائے، اس لیے کہ اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسا مذاق کرنے سے منع کیا گیا ہے جس سے انسان کو تکلیف پہنچے۔ تین آدمی اگر جمع ہوں تو دو آدمی مل کر کوئی سرگوشی نہ کریں، اس لیے کہ اس سے تیسرے کو تکلیف ہوگی۔ گھر میں داخل ہونا ہو، تو سلام کر کے اجازت لو، اس کی بنیاد بھی یہ ہے کہ ایسا نہ کرنے سے اہل خانہ کو تکلیف پہنچے گی۔ کسی کے گھر میں کھانا کھا کر اتنی دیر نہ بیٹھا جائے کہ میزبان کو تکلیف ہونے لگے۔

تمام معاشرتی رسم و رواج اور آداب کی تعلیمات میں یہی اصول کار فرما ہے کہ تمھاری کسی روش سے، کسی قول سے، کسی عمل سے کسی دوسرے انسان کو ایذا نہ پہنچے۔ اس کے اندر حقوق کی ادائیگی بالکل بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ جو حقوق عائد کیے گئے ہیں، انھیں ادا کیا جائے، آدمی ظلم کی راہ پر نہ چلے اور کسی کا حق نہ مارے۔ کسی کی جان، مال، عزت و آبرو، جنھیں اللہ نے حرام کر دیا ہے، اور اللہ کے رسولؐ نے اپنے آخری خطبہ میں حج کے موقع پر کھڑے ہو کر واضح طور پر فرمایا تھا کہ: آج سے تمھاری جانیں، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ دین میں، احادیث میں، قرآن مجید کی تعلیمات میں، آداب میں اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں یہی فلسفہ کام کرتا ہے کہ انسان کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرے انسان کو ایذا پہنچے۔ الا یہ کہ جہاں شریعت سے ثابت ہو جائے کہ جان لینا جائز ہے، وہاں جان لینے کی اجازت ہے۔

اس میں بھی احادیث میں یہ آتا ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نبیؐ کے سامنے کوئی قصاص کا مقدمہ آیا ہو اور آپؐ نے فریقین کو یہ نصیحت نہ کی ہو کہ دیکھو قصاص نہ لو بلکہ معاملے کو ایسے ہی طے کر لو۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کوئی ایسا مقدمہ نہیں جو رسولؐ کے پاس آیا ہو جس میں آپؐ نے دونوں فریقین کو یہ نصیحت نہ کی ہو کہ دیکھو جان کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس معاملے کو دیت کے ذریعے طے کر لو۔ جہاں حکم بھی دیا گیا ہے اور حق ثابت بھی ہو جاتا ہے وہاں بھی یہ نصیحت کی جاتی ہے۔ جہاں نظام باطل کو مٹانے کے لیے اور نظام حق کو قائم کرنے کے لیے اور معاشرے کو بچانے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے، وہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

انسانی تعلقات و روابط کے یہ بنیادی اصول ہیں۔ ان پر تفصیلی غور کی ضرورت ہے۔

پہلا مثبت اصول خدمت کا ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے کہ دین کی کیا تعلیمات ہیں، دین

کا کیا مزاج ہے اور اس کا دوسرا حصہ حقوق کو ادا کر کے ظلم نہ کرنے اور ایذا نہ پہنچانے کا ہے' اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس بارے میں قرآن و حدیث سے جو تعلیمات ملتی ہیں' ان کو جاننے کی ضرورت ہے۔

خدمت اور نفع کی حد تک قرآن مجید میں انسان کی خدمت اور اس کی حاجت روائی کو اللہ کے اوپر ایمان کے برابر نیک عمل ٹھیرایا ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ قرآن نے دراصل اس بات کا ایمان کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ سورہ الحاقہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے کہ اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ اس کو پکڑو اور جکڑو اور جہنم میں ڈال دو۔ اس کی جو چارج شیٹ قرآن نقل کرتا ہے وہ یہ ہے: اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ (الحاقة ۶۹: ۳۳-۳۴) یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔

یہ دو جرائم ہیں: ایک' یہ کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتا تھا۔ دوسرے' یہ کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ یعنی کھانا کھلانا تو خیر بہت ہی زیادہ بڑی بات ہے' صرف یہ کہ دوسروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب تک نہیں دیتا تھا۔

اسی طرح سورۃ المدثر میں' جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے' فرمایا: لوگ پوچھیں گے' تم کو کس چیز نے جہنم میں ڈال دیا۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ (المدثر ۷۴: ۴۳-۴۴) وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے"۔

اسی طرح سورۃ الماعون میں آخرت کے عقیدے کو بیان کر کے فرمایا کہ جو آدمی یتیموں کو دھکے دے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دے' وہ دراصل آخرت کا انکار کرتا ہے۔ آخرت کا کوئی دعویٰ اس کے ساتھ نہیں چل سکتا کہ آدمی انسان کی خدمت نہ کرے اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے۔ اسی طریقے سے اللہ کی محبت میں مال دینا اور خرچ کرنا اور مسکینوں کی' یتیموں کی' بیواؤں کی' قیدیوں کی' سب کی خدمت کرنا ہے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات ایمان اور خدمت کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق کرتی ہیں۔ ان کا رشتہ اتنا گہرا قائم کرتی ہیں کہ بعض غیر مسلموں نے جنھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا یہاں تک کہہ دیا کہ قرآن مجید نے معاشرے کی اصلاح (social reform) کے لیے ایمان کی بنیاد پر معاشرتی تعلقات (social relation) کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

جگہ جگہ یہ تاکید کی گئی ہے کہ اللہ پر ایمان اس لیے لاؤ تاکہ بندوں کی خدمت ہو اور آخرت پر ایمان اس لیے لاؤ تاکہ انسانوں کی خدمت ہو۔ قرآن نے دونوں کو لازم و ملزوم کے طور پر مرتب کیا ہے۔ مختلف احادیث میں مختلف طریقوں سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اصل نیکی یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا

جائے۔ فرمایا' کسی نیکی کو حقیر مت جانو خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی ہو' یہاں تک کہ اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنے کو' اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملنے کو بھی حقیر مت جانو۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے مزے کرتے دیکھا۔ معلوم کیا کہ جنت میں کیسے پہنچا؟ تو معلوم ہوا کہ راستے میں درخت تھا جو لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف دیتا تھا۔ اس نے وہ درخت کاٹ دیا اور اللہ نے اس کے بدلے میں اسے جنت عطا کر دی۔

ہمارے محدثین نے ایک پورا باب مختلف عنوانات سے اس پر باندھا ہے۔ مشکوٰۃ میں "خیرات و صدقے کی فضیلت" اور ریاض الصالحین میں نیکی کے طریقوں کی جو کثرت' حدیث میں بیان ہوئی ہے اس کا بیان ہے۔ ان سب میں یہی بات ہے کہ ہر آدمی کو خیرات کرنا چاہیے' صدقہ دینا چاہیے۔ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر میرے پاس کچھ نہ ہو؟ تو آپؐ نے کہا: دونوں ہاتھوں سے کماؤ' اپنے اوپر بھی خرچ کرو اور دوسروں پر بھی۔ اس نے کہا: یہ بھی میں نہیں کر سکتا۔ تو پھر آپؐ نے کہا: اگر کوئی آدمی حاجت مند ہے اور کسی غم میں مبتلا ہے تو اس کی مدد کرو۔ اس نے کہا: میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ تو آخر میں آپؐ نے کہا: پھر اپنے شر سے دوسروں کو بچاؤ' کم از کم اتنا تو بھلا کام کرو۔ انسانوں کی خدمت کا یہ وہ کردار ہے جو سب سے نمایاں ہے اور جو مطلوب ہے۔

امام بخاریؒ نے نزول وحی کے باب میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ نزول وحی کے بعد رسول کریمؐ غار حرا سے واپس کانپتے ہوئے آئے اور اپنی بیوی سے کہا: "زملونی' زملونی" مجھے اوڑھا دو' مجھے اوڑھا دو۔ انھوں نے کمبل اوڑھایا اور کچھ اطمینان ہوا تو آپؐ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنا پورا واقعہ بیان کیا۔ پھر کہا: قد خشیت علٰی نفسی' مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ آپؐ نے یہ بات اپنے منصب کی عظمت' اس کی بڑائی اور آنے والے خطرات کے پیش نظر اپنے احساس کے تحت فرمائی تھی۔ اس پر ان کی بیوی کیا فرماتی ہیں: اللہ کی قسم' اللہ آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا' یا یہ فرمایا کہ اللہ آپؐ کو نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں' اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں' وہ لوگ جن کا بوجھ اٹھانے کے لیے کوئی تیار نہیں' ان کا آپؐ بوجھ اٹھاتے ہیں' اور جن کے پاس کچھ نہیں' ان کے لیے آپؐ کما کر دیتے ہیں اور مہمانوں کا آپؐ اکرام کرتے ہیں اور حق کے راستے میں جو مشکلات ہوتی ہیں ان میں آپؐ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ آپؐ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا--- یہ آپؐ کا قبل نبوت کا کردار ہے جو آپؐ کی بیوی کے الفاظ میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

ایک دوسرے واقعے میں' حضرت جعفر طیارؓ نجاشی کے دربار میں کھڑے ہیں۔ اس نے پوچھا: تمھارا دین کیا ہے؟ بڑا نازک موقع تھا۔ بین الاقوامی سطح پر' اسلام کے تعارف کا پہلا موقع تھا۔ ان کی جان بھی

خطرے میں تھی، اس لیے کہ کفار قریش کا وفد دربار میں موجود تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ ہمارے بھاگے ہوئے لوگ ہیں، آپ ان کو واپس کر دیں۔ ایسی صورت حال میں حضرت جعفر طیارؓ نے کہا: اے بادشاہ! ہم بتوں کو پوجتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، مردار کھاتے تھے اور بیواؤں اور یتیموں پر ظلم کرتے تھے۔ ہمارے درمیان ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ پتھروں کو پوجنا چھوڑ دو، سچ بولو، ہمسایوں کی مدد کرو، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرو، اور نیک راہ اختیار کرو۔

یہ دین کا تعارف ہے جو بالکل ابتدائی دور میں ایک صحابی کراتے ہیں کہ یہ اصل دین ہے جو ہم کو سکھایا گیا ہے اور جس نے ہماری زندگی بدل دی ہے۔ بتوں کی پوجا چھوڑنے کے ساتھ فوراً سچ بولنا، بیواؤں اور یتیموں کی خدمت کرنا، ہمسایوں کی خدمت کرنا اور عورتوں کی پاک دامنی کے اوپر داغ نہ لگانا، بدکاری سے پرہیز کرنا، یہ وہ صفات تھیں جو انھوں نے بیان کیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو دراصل دین کا یہ پہلو کہ انسان کی خدمت کی جائے اور ہر لحاظ سے اس کی مدد کی جائے، یہ سارے انسانوں کے لیے عام ہے۔

مسلمانوں کو تو ایک دوسرے سے خیر خواہی، محبت اور باہمی ہمدردی کے لیے احادیث کے اندر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً جو مومن کی کسی تکلیف کو دور کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی تکالیف میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ جو مومن کے کسی عیب کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی خامیوں اور گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی مدد کرے۔ جب تک بندہ اپنے کسی بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کی مدد کرے، اس کی حاجت پوری کرے۔

دین کا جو رسمی تصور ہے، اگر اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو یہ احادیث سامنے آئیں گی کہ نبی کریمؐ مصلے پر کھڑے ہیں، اور اقامت کہہ چکے ہیں کہ ایک عورت آتی ہے کہ آپؐ چل کر میرا یہ کام کر دیں۔ آپؐ جماعت چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اس کا کام کرتے ہیں اور پھر آکر جماعت کراتے ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا ارادہ ہوتا ہے کہ طویل نماز پڑھوں، پھر کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چنانچہ میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔ یہ نہیں کہ ماں کو ڈانٹ پھٹکار ہو گی کہ بچے کو رونے کے لیے تم یہاں کیوں لے آئی ہو بلکہ بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو آپؐ نماز مختصر کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں دو مہینے مسجد نبویؐ میں اعتکاف کروں، اس سے زیادہ مجھے یہ محبوب ہے کہ میں ایک گھڑی کے لیے جاؤں اور کسی مسلمان کی خدمت کروں اور اس کی مدد کروں۔

آپؐ کا یہ فیض سب کے لیے عام تھا۔ کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، جو بھی آتے تھے، ان کے ساتھ آپؐ کا سلوک یہی تھا۔ عیسائیوں کا وفد آیا تو آپؐ نے مسجد نبویؐ میں ٹھیرایا۔ ان کے لیے بہترین کھانے پکوائے۔ انھوں نے اپنی عبادت کرنا چاہی تو مسجد نبویؐ میں عبادت کرنے کی اجازت دی کہ تم اپنی عبادت یہاں کر سکتے ہو۔ یہ آپؐ کا اخلاق تھا، رواداری تھی، رحمت تھی۔ یہ اس خدمت کا اثر تھا کہ لوگ کثرت کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ قرآن سن کر ایمان لائے ان کی تعداد تو بہت تھوڑی ہے، آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں، لیکن وہ لوگ جنھوں نے نبی کریمؐ کی شان رحمت دیکھی اور ستم زدہ انسانوں کے ساتھ حسن سلوک دیکھا اور ایمان لائے، ان کی تعداد لامتناہی ہے۔ آج بھی جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان ایمان لانے والوں میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو حضورؐ کی سیرت سے، آپؐ کی رحمت سے، آپؐ کی انسان دوستی سے، اور آپؐ کے انسانوں کے ساتھ تعلق سے متاثر ہو کر ایمان لاتے ہیں۔ برسوں اور صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ دور اول میں بھی یہی تھا کہ لوگ آکر آپؐ کا چہرہ دیکھتے تھے اور جا کر کہتے تھے کہ یہ آدمی تو اتنا فیاض ہے، اتنا بخشنے والا ہے، اور اتنا معاف کرنے والا ہے، اس پر تو ہم ضرور ایمان لائیں گے۔ یہ انسان کے ساتھ محبت و تعلق کی وہ کیفیت ہے جو قرآن و حدیث سے واضح ہوتی ہے۔

اس بات کی اس قدر اہمیت اس لیے ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے جو بھی عبادتیں لازم کی ہیں، وہ اپنے لیے نہیں کی ہیں، اسے کسی عبادت کی حاجت نہیں ہے۔ اس کو سجدے کی، اور رکوع کی اور تسبیح کی اور تقدیس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ آسمان کے اوپر چار انگل جگہ بھی خالی نہیں، جہاں کوئی فرشتہ اللہ کی عبادت نہ کر رہا ہو۔ فرشتوں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ہم تو آپ کی تسبیح کرتے ہیں، تقدیس بھی کرتے ہیں، پھر آپ نئی مخلوق کیوں بنا رہے ہیں؟ اس کو آپ اختیار دیں گے، آزادی دیں گے، وہاں جا کر بھائی بھائی کا خون بہائے گا اور بھائی بھائی کی زندگی کو بگاڑے گا۔ یہ تو زمین میں فساد مچائے گا۔ اگر آپ کو یہی مطلوب ہے کہ آپ کی بندگی اور پرستش ہو، یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ مگر یہ اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان، انسان کے لیے انسان بنے، رحمت کا فرشتہ بنے۔ اسی لیے انسان کی خدمت ساری عبادات کے اوپر بھاری ہے۔

انسان کا حق مارنا اور اس کو ایذا اور تکلیف پہنچانا، ساری عبادات کو زائل کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز آدمی کے نامہ اعمال کے تین حصے ہوں گے، الگ الگ تین پرتیں ہوں گی۔ ایک فائل ہو گی جس میں وہ چیز ہو گی کہ جس کو اللہ ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ ایک وہ فائل ہو گی جس کی اللہ کو کوئی پرواہ نہیں ہو گی کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوا ہے۔ ایک تیسری فائل وہ ہو گی جس میں سے وہ ایک حرف بھی نہیں چھوڑے گا جس کا کہ حساب نہ لے۔ پہلی فائل کے اندر اللہ کے ساتھ شرک

ہو گا جس کو وہ معاف نہیں کرے گا۔ دوسری فائل میں جس کی اس کو کوئی پروا نہیں ہو گی، یہ وہ معاملات ہیں جو انسان کے اپنے نفس یا اللہ کے ساتھ ہیں، یعنی نماز نہیں پڑھی، روزہ چھوٹ گیا یا اور کچھ ہو گیا، اس کی اللہ کوئی پروا نہیں کرے گا۔ اگر چاہے گا تو بخش دے گا اور چاہے گا تو پوچھ گچھ کرے گا۔

تیسری فائل جس کا وہ ایک حرف بھی نہیں چھوڑے گا، وہ ہے جس میں انسان اور انسان کے باہمی حقوق اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی اور باہمی معاملات و تعلقات کا بیان ہو گا۔ اس نامۂ اعمال سے وہ ایک حرف بھی اپنے ذمے نہیں لے گا۔ یا تو مدعی کا اور مظلوم کا حق ادا کرے گا یا اگر بندہ کسی اور وجہ سے بڑا محبوب اور پیارا ہو گا، تو وہ مدعی کو کچھ اور دے کر راضی کرے گا تاکہ وہ معاف کر دے۔ لیکن وہ خود سے معاف نہیں کرے گا کہ میں نے معاف کر دیا۔

اس بات کو انتہائی موثر انداز میں ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ سوالیہ انداز میں، اور یہ آپؐ کی تعلیم و تربیت کا عام انداز تھا کہ آپؐ سوال کر کے لوگوں کے ذہنوں کو چونکاتے تھے۔ پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ میری امت کے اندر مفلس [غریب] آدمی کون ہے؟ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ نے سوچ کر کہا کہ مفلس تو وہ ہے جس کے پاس روپے پیسے نہ ہوں، مال و متاع نہ ہو۔ آپؐ نے کہا کہ میری امت کا مفلس اور غریب وہ نہیں ہے۔ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز آئے گا، بہت ساری نمازیں اور بہت سارے روزے اور بہت سارے صدقات جمع کر کے لائے گا اور پھر اس طرح آئے گا کہ کسی کو برا بھلا کہا ہو گا، کسی کو گالی دی ہو گی، کسی کا مال کھایا ہو گا، کسی کا خون بہایا ہو گا، کسی کو مارا ہو گا۔ اس کے بعد اللہ کے حضور سارے مدعی کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر مختلف مدعیوں کو اس کی نیکیاں بانٹ دی جائیں گی، یہاں تک کہ جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی، تو پھر ان مدعیوں کے گناہ لے کر اس کے سر پر ڈال دیے جائیں گے کہ اب اس معاملے کو طے کرنے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

نماز، روزوں اور صدقات کے باوجود یہ معاملہ ہو گا۔ اس لیے کہ یہ وہ دن ہو گا جب درہم و دینار کام نہیں آئیں گے۔ آخرت میں جرمانے کے معاملات کو طے کرنے کے لیے جو کرنسی چلے گی وہ مال و اسباب کی نہیں بلکہ نیک اعمال کی کرنسی ہو گی۔ آدمی کو اسی کرنسی اور سکے کے ذریعے معاملہ طے کرنا پڑے گا۔ یہاں قتل کی اور دوسری چیزوں کی آدمی مال سے دیت ادا کر سکتا ہے۔ لیکن وہاں مال سے ادا کرنے کا موقع نہیں ہو گا۔ وہاں نیک اعمال ہی وزن رکھیں گے اور سارے نیک اعمال سے ان برے اعمال اور غصب شدہ حقوق کو ادا کرنا ہو گا۔

انسانی حقوق اور انسانی جان کی اس قدر اہمیت ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا کہ جس نے ایک جان کو بھی

بے گناہ مارا اس نے گویا سارے انسانوں کو ختم کر دیا اور جس نے ایک انسان کو بھی زندہ رکھا اس نے گویا سارے انسانوں کو زندہ رکھا۔ جہاں مومن کے قتل کا ذکر ہے وہاں تو عجیب انداز بیان ہے۔ یعنی جس سے قتل خطا ہو گیا وہ کم سے کم ایک غلام کو آزاد کر دے اور اس کا فدیہ دے اور جس نے جان بوجھ کر مارا تو اس کے لیے قرآن نہ کسی فدیے کا ذکر کرتا ہے' نہ کسی معاوضے کا' بلکہ کہتا ہے کہ ہم اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیں گے۔ یعنی قتل عمد کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کا کوئی مداوا ہو سکے بلکہ خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس کی سزا تو پھر یہی ہے کہ مقتول کے وارث معاف کر دیں یا پھر آدمی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلے۔ اللہ نے قانون قصاص کو کس حکمت سے بیان کیا ہے کہ پہلے مال کی حرمت قائم کی' اور پھر جان کی حرمت قائم کی۔ اس کے بعد جان و مال کے ساتھ جسم کے سارے اعضا کی حرمت قائم کی۔ النفس بالنفس والعین بالعین والاذن بالاذن' یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان' اور جان کے بدلے جان۔ گویا اس نے پورا قصاص کا قانون نافذ کیا اور کہا کہ امت کے لیے زندگی اگر ہے تو اسی قصاص کے قانون میں ہے۔ اس کے بعد مال کی حرمت قائم کی کہ ایک انسان کا پیسہ دوسرے کے اوپر حرام ہے۔ معمولی سے معمولی رقم اور زمین کا ایک ٹکڑا بھی اگر کسی نے دبالیا تو وہ اس دن آگ کا طوق بن کر اس کے گلے میں لٹک جائے گا۔ اگر کسی نے مال غنیمت میں سے کوئی ایک عبا بھی چوری کر لی تو فرمایا گیا کہ تم اس کو شہید کہتے ہو' یہ تو جہنم میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے مال غنیمت سے چوری کی۔

وہ مال جو کہ کسی دوسرے کی ملکیت ہو' یا جو جماعت کی ملکیت ہے' اس کا ناجائز کھانا اور حرام کھانا' اس کے بارے میں اتنی سخت وعید کی گئی ہے۔ اس کے بعد عزت و آبرو کو حرام کیا۔ مسلمان' مسلمان کے ساتھ تمسخر نہ کرے' اس کا مذاق نہ اڑائے' اس کو گالی نہ دے' اس کی غیبت نہ کرے' اس کی تذلیل نہ کرے' اس کی تحقیر نہ کرے اور برا بھلا نہ کہے۔ یہ سارے احکام قرآن مجید نے خود بھی بیان کیے اور حدیث کے اندر بھی ان احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اگر آپ ان پر غور کریں تو مثبت و منفی' دو اصول بنتے ہیں۔ ایک' یہ کہ انسان کی خدمت' اس کے ساتھ محبت اور اس کے لیے سوز و درد۔ جیسا میں نے کہا کہ دراصل اقامت دین' جہاد اور دعوت کی بنیاد یہی ہے۔ جب یہ بنیاد زندگی کے اندر رائج ہو گی' جاری و ساری ہو گی' تب ہی انسانوں کے ساتھ وہ تعلق قائم ہو سکے گا کہ انسان اس دعوت پر لبیک کہیں۔ جب تک یہ دعوت کتابوں میں لکھی رہے گی' اور مجرد الفاظ و دلائل کے ساتھ پیش کی جاتی رہے گی' اس وقت تک عام انسان کے لیے اس میں کوئی کشش نہ ہو گی۔ انبیا کی دعوت بھی اسی وقت مقبول ہوئی جب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نبی کے اخلاق اور برتاؤ کو دیکھا۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی مدد اور حاجت روائی' خوشی و غمی میں شرکت' اور ان کے ساتھ

تعاون' جس طرح بھی ممکن ہو' یہ بڑی عظیم الشان نیکیوں میں سے ہے۔ نماز' روزہ اور زکوٰۃ اور دیگر سب چیزوں سے زیادہ بڑی نیکی اس کو قرار دیا گیا ہے۔

دوسری طرف سب گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ' انسانوں کے حقوق مارنا اور انسانوں کو تکلیف پہنچانا ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے یہاں تک کہا کہ جس نے مسلمان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی' اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی۔ جس نے مسلمان کو خوش کر دیا اس نے مجھے خوش کر دیا' اور جس نے مجھے خوش کر دیا اس نے اللہ کو خوش کر دیا۔ گویا اللہ کے رسولؐ نے مسلمان کے دل کا' اس کی عزت کا' اس کی تکلیف اور اس کی پریشانی کا براہ راست رشتہ اپنی ذات کے ساتھ جوڑ کر' پھر اللہ کے ساتھ جوڑا۔ ساری کی ساری' جتنی بھی تعلیمات ہیں ان کو سمیٹ کر ان دو ہی اصولوں کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے' ایک مثبت اور ایک منفی۔

اگر آدمی کے بس میں مثبت نہ ہو' تو جس طرح حدیث میں کہا گیا ہے کہ کم از کم اپنے شر سے لوگوں کو بچاؤ۔ یہ کم سے کم ہے' جو تم کر سکتے ہو۔ اگر ہاتھ سے کما نہیں سکتے' دینے کے لیے دولت نہیں ہے' چلنے کے لیے سکت نہیں ہے' کسی حاجت مند کی مدد نہیں کر سکتے' تو کم سے کم اپنی زبان سے ایسی بات نہ کہو' اور اپنے ہاتھ سے ایسا کام نہ کرو جس سے شر پیدا ہو اور کسی کو تکلیف پہنچے۔ یہ نیکی اور صدقے کا کم سے کم درجہ ہے جو انسان کے بس میں ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو وہ کم سے کم یہ نیکی ضرور کر سکتا ہے۔

مثبت طور پر مدد' اور منفی طور پر ایذا رسانی سے پرہیز' یہ دراصل اسی رحمت کی دو شاخیں ہیں جس کے اوپر قرآن نے اللہ کا تعلق بندوں کے ساتھ قائم کیا۔ الرحمٰن' وہ رحمٰن ہے جو بڑی رحمت کرنے والا ہے اور مسلسل رحمت کر رہا ہے۔ وہ رحیم بھی ہے اور اس نے چاہا ہے کہ اس کے بندے بھی آپس میں اسی رحمت کا مظہر ہوں۔ مومن ایک دوسرے کے ساتھ سراپا رحمت ہوں' رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ' اور مومن اپنے رسولؐ کی پیروی میں دوسرے انسانوں کے لیے بھی سراپا رحمت ہوں۔ رسولؐ اللہ رحمت للعالمین تھے۔ اہل ایمان کو انسانوں کے لیے بھی رحمت ہونا چاہیے۔

اللہ سے تعلق کے بعد دعوت کے لیے' اقامت دین کے لیے' جہاد کے لیے' اور تنظیم کے لیے' سب سے اہم چیز یہ ہے۔ سب کاموں میں اس کی یہی اہمیت ہے جو ملحوظ رہنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اللہ اگر یہ چاہے گا کہ اس کا نام لینے والے انسانوں کے اوپر حکمران بنیں تو وہ یہی چاہے گا کہ ایسے نام لینے والے ہوں جو بندوں کے اوپر خدا بننے اور ظالم بننے اور ان کے اوپر دست درازی کرنے والے نہ ہوں بلکہ ایسے لوگ ہوں جو ان سے محبت کرتے ہوں۔ ان کے خادم بنیں اور خادم بن کر خدمت کریں۔ صحابہ کرامؓ نے اسی مقام پر پہنچ کر دنیا کی امامت و حکومت حاصل کی۔ جہاں وہ جاتے تھے تو بغیر اس کے کہ وہ لڑیں لوگ شہر

کے دروازے کھول دیتے تھے، لوگوں کے دل فتح ہو جاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ طارق بن زیاد چند سو آدمی لے کر اسپین گیا، پورا اسپین فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم چند سو آدمی لے کر ہندستان آیا، پورا سندھ فتح کر لیا۔ یہ لڑائی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے تھا کہ یہاں کے باشندے پہلے سے ہی اسلام کے لیے مسخر ہو چکے تھے، ان کے دل اس کے لیے کھل چکے تھے۔ عرب تاجروں کے بھارت سے تعلقات بہت واضح اور صاف تھے، اور اسپین بھی بہت دور نہیں تھا۔ مسلمان لیبیا، تیونس اور مراکش تک پہنچ چکے تھے اور لوگوں کے دل واقف تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک جگہ مسلمانوں کو جنگ کی وجہ سے اپنا شہر خالی کرنا پڑا، تو انھوں نے لوگوں سے جو جزیہ وصول کیا تھا وہ لوگوں کو واپس کر دیا۔ عیسائی بھی رونے لگے کہ ایسے لوگ تو ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان رہیں اور ہمارے اوپر حکومت کریں۔

لوگوں نے دل کھول کر دین کا استقبال کیا، وہ استعمار پسند نہیں تھے۔ جہاں گئے وہیں بس گئے، وہیں شادیاں کیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے خادم تھے۔ ان کے حکمران بھی لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ خود جھوٹا موٹا پہنتے تھے، روکھی سوکھی کھاتے تھے لیکن انسانوں کی خدمت کرتے تھے۔ اس کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہ کردار اسلام کی انھی تعلیمات کے نتیجے میں ابھرا تھا۔

اسی کردار نے ان کو انسانوں کا محبوب بنا دیا تھا اور رحمٰن کا بھی محبوب بنا دیا تھا۔ جب انسان رحمٰن کا بھی محبوب بن جائے، اور انسان کا بھی محبوب بن جائے، تو کوئی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ کامیابی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے جتنی ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنی عبادات پر توجہ دے، اپنے اخلاق پر توجہ دے، اللہ کی راہ میں اپنا جان و مال خرچ کرے، وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آدمی کے اپنے کردار کے اندر یہ دو صفات بھی ہوں کہ وہ دوسروں کی خدمت کرے اور انھیں ایذا نہ پہنچائے۔ لوگ یہ محسوس کریں کہ یہ رحمت کے فرشتے ہیں جو ہمارے درمیان چل پھر رہے ہیں۔ ان کے غالب آنے سے اور اوپر آنے سے ہماری زندگی رحمت اور برکت کے ساتھ بھر جائے گی۔

میں نے شروع میں حدیث بیان کی تھی کہ اگر تم زمین والوں پر رحم کرو گے تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم زمین والوں پر رحم نہیں کرو گے تو اوپر والا بھی تم پر رحم نہیں کرے گا۔ یہ بات اگر ہمیشہ سامنے رہے اور کوشش کی جائے کہ اپنے قول و فعل سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچانے سے بچا جائے، تو یہ مطلوبہ مومنانہ اور داعیانہ کردار وجود میں آسکتا ہے۔

ہم سب کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر اس پہلو سے اصلاح کریں اور اپنے کردار کی تعمیر کریں۔ انفرادی کردار کی تعمیر یقیناً تعمیر معاشرہ کی بنیاد بن سکتی ہے۔

جدیدیت' تجدید اور اسلام

ڈاکٹر انیس احمد ○

یورپ میں' جس نشات ثانیہ (renaissance) اور تشکیل جدید (reformation) کی تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے ہوا' بہت جلد اس کے اثرات یورپ کے دیگر ممالک میں پھیل گئے۔

جس طرح اطالیہ (Italy) میں یونان کے قدیم علوم کی حیات ثانی (rebirth) کی تحریک چلی' ایسے ہی فرانس' جرمنی وغیرہ میں کلاسیکی ادب' فن تعمیر' موسیقی اور علوم کے احیا کی تحریک' احترام آدمیت (humanism) کی معصوم اصطلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی ردعمل کی بازگشت جرمن عیسائی مفکر مارٹن لوتھر کے معاصر اراسمس (Erasmus) کی تحریروں میں رونما ہوئی اور بہت جلد تقلید پسند عیسائیت کی گرفت معاشرے کے ذی شعور اور صاحب فکر افراد پر ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئی۔ ارسطو' افلاطون اور دیگر فلاسفہ اور متکلمین کی فکر پاپاے روم کے مقابلے میں زبان زدعام ہونے لگی۔ یونانی فکر کی یہ حیات ثانی زندگی کے ہر شعبے پر اثرانداز ہوئی۔ نتیجتاً جدید یورپی انسان نے اپنے تصور' اخلاق' معاشرت' معیشت و قانون' ہر شعبہ حیات سے مقلدانہ عیسائیت کو خارج کر کے ایک لادینی طرز فکر کو اختیار کرنا شروع کیا۔

ا

سولھویں صدی میں مسلم دنیا سے روابط اور تبادلہ فکر کے نتیجے میں یورپ میں ایک علمی و فکری انقلاب کا آغاز تو ہو چکا تھا۔ تجرباتی علوم اور علوم عقلیہ کی ترقی پذیری کے ساتھ جامد مذہبیت زوال کی طرف جانا شروع ہوئی۔ اس عرصے میں طبیعیاتی' حیاتیاتی اور کیمیاوی علوم میں دریافتوں نے' مذہب کے

○ پروفیسر' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' اسلام آباد

مقابلے میں ایک لادینی (سیکولر) رجحان کو پروان چڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بہت جلد وہ کلیسا جو کل تک ہر معاملے میں حرف آخر تھا، اب اپنی چار دیواری میں بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ کارزار حیات سے اس کا اثر برق رفتاری کے ساتھ کم ہونا شروع ہو گیا اور "انسان دوستی" (humanism) کے نام پر مذہب سے عاری ایک لادینی طرز فکر میدان حیات میں فتح مندی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھنا شروع ہوا۔ اسی دور میں یورپ کی عسکری اور سیاسی قوت میں اضافہ ہوا اور اس کی مقابل دوسری قومی و مذہبی قوتوں کے اضمحلال، سیاسی طوائف الملوکی، اخلاقی زوال اور معاشی طور پر دوسروں پر انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لادینیت پرست یورپی استعماری قوتوں کو دنیا کے ایک وسیع و عریض خطے، خصوصاً مسلم ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع ملا۔

اپنی زبوں حالی اور یورپی سامراج کی چمک دمک سے متاثر ہو کر بہت سے اہل علم نے یہ عاجلانہ نتیجہ اخذ کیا کہ "ترقی اور لادینیت میں ایک منطقی ربط ہے"۔ چنانچہ جس طرح مغرب نے بظاہر یونانی فکر کی حیات ثانی کے ذریعے مقام ترقی حاصل کیا تھا، ان مفکرین نے بھی دین اسلام کو، عیسائی تقلید پسند مذہبیت کے مساوی قرار دیتے ہوئے اور بقیہ کاروبار حیات کو دنیاوی عمل قرار دیتے ہوئے، انسانی عقل کو اپنے لیے خود ضابطہ تجویز کرنے کا حق دے دیا۔ گویا سیاست، معیشت، تعلیم، قانون اور معاشرت کو دنیاوی سرگرمی قرار دیتے ہوئے "روحانی" اور "مذہبی" پابندیوں سے آزاد سمجھ لیا گیا۔ انھوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا کہ دنیاوی معاملات میں دنیا والوں کے انداز اختیار کیے جائیں اور اگر ضرورت ہو تو نکاح، طلاق اور وراثت جیسے ذاتی معاملات میں جہاں تک ہو سکے مذہبی ضابطوں پر عمل کیا جائے۔

مغرب نے مذہب سے اپنی آزادی کی تحریک کو "جدیدیت" (modernism) کا نام دیا اور بظاہر تجدید و تجدد میں کوئی بنیادی فرق نہ کیا۔ تجدد کے زیرعنوان عیسائیت کے تصور خدا پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے، الوہیت کے دائرہ کار کو کلیسا میں محدود کیا۔ اس کے بعد نہ صرف ادب، فلسفہ اور فنون میں مشرکانہ اور اصنام پرست یونانی طرز فکر کو رائج کیا، بلکہ عملاً عیسائیت کے بطور ایک مذہب بساط لپیٹنے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ عصر حاضر کی اس نئی بساط کے لیے کچھ نئے قواعد و ضوابط کا تعین بطور ایک متبادل نظام کے بھی کر دیا گیا۔

اب ایک نئی دنیا، اور نئے دور کے وجود میں آنے کے ساتھ اخلاق، قانون، معاشرت، معیشت، ثقافت اور سیاست میں انسان کی اپنی رائے، اس کا اپنا فیصلہ، اس کی اپنی عقل حرف آخر قرار پائی۔ نظام کلیسا کی پاپائیت (برہمنیت) کی مرکزی قیادت کے اختیار کے ساتھ عیسائیت کے الوہی نظام کو بھی معلق و معطل بلکہ برخواست کر دیا گیا۔

نئے بازی گروں نے اس نئے دور میں، سائنسی ترقی، عقل پرستی، انفرادیت پرستی اور مادہ کی بالادستی کو

جزو ایمان قرار دیتے ہوئے، کلیسا کی حکومت (theocracy) کی جگہ لادینی جمہوریت (سیکولر ڈیموکریسی) کو دور جدید کے مثالی نظام کے طور پر پیش کیا۔ ترقی اور عقلی رویے کو صرف اور صرف لادینی جمہوریت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور ایک نئی معاشی دنیا کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔

مسلمان دانش وروں کے ایک طبقے نے اپنی فکری اور ثقافتی پسماندگی و زبوں حالی کے پیش نظر، اس چڑھتے ہوئے مغربی سورج کے سامنے اپنے فکری احساس کمتری کی بنا پر، خود آگے بڑھ کر نیک خواہش اور تمنا کے ساتھ فکری غلامی کے مغربی کنگن اپنے ہاتھوں میں پہن کر اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہی، جب کہ ایک دوسرے طبقے نے تحفظ ذات کے لیے لادینیت کے اس سیاہ بادل اور اس کی گرج چمک سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر کے خود کو ماحول و معاشرہ سے غیر متعلق کرنے اور ماضی کی روایات کو سینہ سے لگانے اور دانتوں سے پکڑ لینے کو اپنا کمال سمجھا۔

اسلامی تہذیب و تمدن کا یہ ایک قابل غور پہلو ہے کہ جب بھی وہ فکری، اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال کا شکار ہوئی ہے، خود اس کے اندر ایک ایسی تحریک ابھری جو اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کا سبب بن سکے۔ عصر حاضر میں مغرب کے لادینی تسلط و تصورات نے اسلامی تہذیب کی اس صلاحیت کو پھر موقع فراہم کیا۔ ہمیں یہ کہنے میں قطعاً کوئی تردد نہیں کہ اسلامی احیا کی کیفیت کے پیش نظر بیسویں صدی کے لیے اگر کوئی نمایندہ عنوان تجویز کیا جا سکتا ہے، تو وہ صرف تحریکات احیاے اسلام کی صدی ہے۔

یہ احیاے اسلام جہاں امت مسلمہ کے لیے خود اعتمادی کے حصول اور احساس کمتری سے نجات کا سبب بنا، وہیں مغربی مفکرین کے لیے یہ احیائی تحریکات فکری تشویش بلکہ گہرے فکری مغالطے کا سبب بن گئیں۔ مغربی تجزیہ نگاروں کو مسلسل یہ فکر لاحق رہنے لگی کہ:

- تجدید و احیاے دین کی اصلاحی تحریکات اگر کامیاب ہو گئیں تو ان کی نئی دنیا کی شکل کیا ہو گی؟
- کیا اسلامی تحریکات کا تصور دین اسلام، قرآن و سنت کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کرے گا جو یورپ نے عہدنامہ قدیم اور عہدنامہ جدید کے ساتھ اختیار کیا؟
- کیا احیاے دین کے نتیجے میں فقہا اور علما، زمام کار سنبھال کر تمام سائنسی تحقیقات کو بیک جنبش قلم معطل کر دیں گے اور پھر اندھی تقلید کا دور شروع ہو جائے گا؟
- کیا اسلام کی دوبارہ میدان عمل میں آمد مذہبی اور صلیبی جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہو گی؟
- کیا آزادی فکر اور حریت عمل کو باقی رکھا جائے گا؟
- جدیدیت اور تجدید کے زیر اثر اسلام کی کون سی تعبیر پر عمل کیا جائے گا؟
- وہ اسلام جو خانقاہوں اور دینی مدارس میں پایا جاتا ہے یا وہ جو مغربی تعلیم زدہ دانش ور پیش کرتے

ہیں، ان میں سے کون سا اسلام مطلوبہ اسلامی ریاست میں نافذ کیا جائے گا؟

○ خواتین اور غیر مسلموں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے گا؟ کیا انھیں انسان تسلیم کیا جائے گا؟ کیا اسلامی حکومت میں خواتین پر لازمی حجاب اور مردوں پر لازمی داڑھی کی پابندی ہو گی؟

○ کیا ٹیلی ویژن پر صرف درس قرآن، درس حدیث، نعت رسولؐ اور چند دنوں کے لیے مرثیے بھی پڑھے جائیں گے اور فنون لطیفہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے گا؟

○ دین کی مختلف تعبیرات جن کی گنجایش خود قرآن و سنت میں موجود ہو، ان میں سے کس کو درست مانا جائے گا؟

○ مذہب کے نام پر دہشت گردی، انتہاپسندی اور تشدد کا کیا مقام ہوگا؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جو مغرب کے فکری مغالطہ اور تشویش کا ایک ہلکا سا عکس تجدد اور تجدید کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

ان میں سے کسی بھی مغالطے کا جواب اثبات یا نفی میں دینا نہ مسئلے کا حل ہوگا، اور نہ کسی فکری گرہ کے کھولنے میں مددگار ہوگا۔ شاید ان مسائل پر غور کرنے کا آغاز خود اہل اسلام کے ہاں زیادہ مناسب ہو۔ یہی چیز تجدد اور تجدید کا سوال حل کرے گی، اور عمومی سطح پر مذکورہ سوالوں کا جواب عطا کرے گی۔

۲

تغیر اور تبدیلی ایک ایسا فطری عمل ہے، جسے بطور ایک خبر کے اور بطور عبرت کے بھی، خود قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں جابجا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ اقوام عالم کے عروج و زوال، قیادت پر فائز یا معزول کیے جانے کو قرآن کریم میں آفاقی اخلاقی ضابطے کے طور پر بیان کیا گیا ہے:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج (ال عمرٰن ۳:۱۴۰) یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

قرآن کریم کے اس آفاقی اخلاقی ضابطے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی تائید و نصرت کے ساتھ تبدیلی و تغیر کے لیے انسانوں کے اپنے طرز عمل اور اکتساب کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں تبدیلی اسی وقت واقع ہوتی ہے، جب افراد میں حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے نفوس، افکار و اعمال میں تبدیلی کے ذریعے قومی اور عالمی سطح پر قیادت کا کردار ادا کرنا چاہیں۔ اس اصول کو مزید وضاحت کے ساتھ ایک اور مقام پر یوں بیان فرمایا گیا ہے:

یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت

تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (الانفال ۸:۵۳)

تغیر و تبدیلی کا قرآنی تصور انسان کو اس کی قوت ارادی اور صلاحیت عمل کی بنا پر زمان و مکان میں قوامیت کا مقام عطا کرتا ہے۔ گویا انسان، تاریخ کی پیداوار یا غلام نہیں ہے بلکہ خود تاریخ ساز ہے۔ اس کے برعکس مادی تعبیر تاریخ، انسانی معیشت، معاشرت، سیاست، ثقافت، حتیٰ کہ "مذہب" کو بھی مادی جدلیاتی عمل کے زیراثر ایک تاریخی عمل کی پیداوار (product) قرار دیتی ہے۔ منطقی طور پر تاریخ کی اس تعبیر میں انسان کا معاشرتی اور معاشی عمل، جسے کمتر سے بہتر کی طرف ایک سفر تصور کر لیا گیا ہے، یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نقش کہن کو خواہ وہ مذہب ہو، ثقافت ہو، اخلاق ہو، معیشت و معاشرت اور سیاست ہو، زمان و مکان میں تبدیلی و ترقی کے ساتھ منسوخ و معدوم ہو جانا چاہیے۔

اس تاریخی تناظر میں جب یورپ نے اپنے تاریک جاہلی دور سے مقابلتاً کم تاریک جاہلی دور میں قدم رکھا، تو نشات ثانیہ اور تجدد کی تحریک نے ماضی کی تمام روایات بالخصوص عیسائی مذہب کو فرسودہ، ناقابل عمل، ماضی پرست اور غیر عقلی قرار دیا، اور جدید جاہلی انسان کو آزادی کا پیغام سناتے ہوئے رواداری و ترقی کے دور کے آغاز کا مژدہ سنایا۔ اس کے نتیجے میں مغربی مفکرین کے بقول اب ایک "لبرل انسانیت دوست" تہذیب کا دور شروع ہوا، جسے modern (جدید) قرار دے دیا گیا اور جدیدیت (modernism) کے زیرعنوان ماضی کی ہر روایت کو نشانہ جراحت بناتے ہوئے ہر شعبہ حیات میں "فرد کی آزادی" کو اپنا منشور قرار دیا، یعنی فرد جو چاہے، جس طرح چاہے اور جب چاہے، اپنے لیے ضابطہ حیات تجویز کرے۔

جدیدیت پر، جدید جاہلی تہذیب کے انسان کا یہ فخر و ناز زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا۔ بیسویں صدی تک سفر کرتے کرتے اس پر یہ راز کھلا کہ جس چیز کو جدیدیت قرار دیا گیا تھا، وہ بھی اضافی ہی تھی، مستقل نہ تھی۔ اس لیے اب "جدیدیت سے اگلے قدم" (post-modernism) کے زیرعنوان ایک نئے سفر کے آغاز کی ضرورت محسوس کی گئی۔

دوسری جانب گذشتہ ۲۰۰ سال کے عرصے میں مسلم آبادیوں پر مغربی استعمار، ثقافتی یلغار اور خود مسلم آبادیوں کے فکری جمود کے نتیجے میں، مغرب کے لادینی تعلیمی نظریات اور طبقاتی نظام کے زیراثر ذہنی طور پر ایک محکوم نسل وجود میں آگئی۔ اس نسل نے مغربی اقدار حیات، معیار حق و باطل، ثقافتی رجحانات اور علمی روایت کو صحیفہ آسمانی سمجھتے ہوئے اپنے قلب و نظر کا حصہ بنا لیا۔ پھر مغربی تعبیر تاریخ کی روشنی میں اسلام کو بھی ساتویں صدی میں منظرعام پر آنے والا ایک "مذہب" تصور کرتے ہوئے معاشرتی، سیاسی اور معاشی و قانونی معاملات کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا: وہ رسوم و رواج جو ماضی میں ایک "بدویانہ" ثقافت کی

پیداوار تھے، آج کیوں اختیار کیے جائیں؟ حجاب جیسی ''دقیانوسی'' روایت کو، جسے اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے نہ صرف ضابطہ لباس بلکہ ضابطہ اخلاق قرار دیا، آج بھی اختیار کیا جائے گا؟ ایسا کرنا علامتی سطح پر رجعت پسندی ہو گا یا آزادی نسواں کی علامت قرار دیا جائے گا؟ سیاسی، قانونی اور معاشی دائرہ کار میں کیا خلافت کے قیام کے بغیر کوئی نظام اسلامی نہیں کہا جا سکے گا؟ کیا آج معاشی ترقی کے لیے، جس کی بنیاد سود ہے، اس کے برعکس قرآن کی معاشی تعلیمات پر عمل کیا جا سکے گا؟ کیا قرآن و سنت کے قوانین جو بظاہر ساتویں صدی میں منظر تاریخ میں آئے، تبدیلی زمانہ کے باوجود آج کے سنجیدہ معاشی و سیاسی حالات میں رائج کیے جا سکیں گے؟

ان سوالات کو اٹھانے والا ذہن چاہے مغرب کا مکمل ذہنی غلام اور سیاسی و معاشی تابع فرمان ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے اس کا تصور تاریخ مطلقاً باطل اور محدودیت کا شکار ہی کیوں نہ ہو، اس کے باوجود ان سوالات کا اٹھایا جانا ایک قابل تحسین عمل ہے، بلکہ اقتضاے شریعت ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل روح وہ حریت فکر ہے، جس میں ایک فرد اپنی ذہنی روایت کی غلامی سے نکل کر معروضی طور پر خود اپنے معتقدات، رسوم و رواج اور طرز عمل کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کہاں تک حق، عدل اور عقل کے تقاضوں سے عہدہ براء ہو رہا ہے۔ قرآن و حدیث نے ہر معاملے میں خواہ وہ عقیدے کا ہو، عائلی نوعیت کا ہو، فوج داری معاملات سے تعلق رکھتا ہو، غرض نوعیت مسئلہ کچھ بھی ہو، تعقل، تفکر، تدبر، تحقیق، تجزیہ و تحلیل کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے یہ سوالات بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان سوالات کے جوابات قرآن و سنت میں تلاش کرنے کے بجائے یہ مفروضہ اختیار کرنا کہ ''اسلام کا عائلی نظام ''فرسودہ'' ہو گیا، اب اس کی جگہ برطانوی، فرانسیسی، ڈچ یا اطالوی قوانین نافذ کر کے جدیدیت کو اختیار کیا جائے'' واضح طور پر غلامانہ ذہن و روح کا پتا دیتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ ایک سادہ اور چھوٹی سی بات جو مغرب زدہ افراد اور مغرب کے خاصے معقول ذہنوں میں نہ سما سکی، یہ ہے کہ دنیا کی تمام ثقافتوں، تہذیبوں اور ''مذاہب'' کو ایک محدود پیمانے پر جانچنا عقلی اعتبار سے اور نہ منطقی لحاظ سے موزوں عمل ہے۔ اگر بعض مذاہب میں تغیر و تبدیلی کے عمل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور وہ جامد تقلید اور اندھی پیروی کا شکار ہوئے، تو ضروری نہیں کہ ہر نظریۂ حیات کے خمیر میں یہ خامی پائی جائے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جدید مسائل کے حل اور اسلام کے آفاقی و ابدی اصولوں کو نئے حالات میں نافذ و رائج کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی حیات مبارکہ میں ایک ایسا اصول تعلیم فرما دیا تھا، جو عبادات، معاملات، قانون و اقتصادیات غرض ہر شعبۂ حیات میں پیش آنے والے مستقبل کے مسائل کو جدید مطالبات کے پیش نظر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس اصول کو

حدیث شریف میں "اجتہاد" کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام کی فکری اور علمی تاریخ میں اجتہاد کا اصول کسی ایسے دور کی پیداوار نہیں ہے، جس میں اچانک عقلیت پرستی (rationalism) کے فروغ کی بنا پر چند علما و فلاسفہ نے اپنی دانش مندی اور دانش وری کے سہارے اس کا سراغ لگالیا ہو۔ نہیں، بلکہ اس کی تعلیم خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت بیان فرمائی اور قیامت تک کے لیے اسلام میں تجدید اور جدید مسائل کے حل کی صلاحیت و حکمت عملی کو متعین فرما دیا۔

جب امت مسلمہ نے اس ابدی اصول کی حقیقت کو سمجھا اور استعمال کیا تو وہ طب، کیمیا، طبیعیات، انجینئرنگ، فقہ، فلسفہ، اخلاقیات، ادب، غرض ہر شعبہ علم میں وہ علمی انقلاب لائی جس پر آج تک انسانی تہذیب و ثقافت فخر کرتی ہے۔ لیکن جب اپنی تنگ نظری اور بالخصوص دین و دنیا میں تفریق کے لادینی بیرونی تصور کے زیراثر اس نے اجتہاد کے دائرہ کار کو محض شخصی معاملات اور طہارت کے مسائل تک محدود کرلیا اور سیاسی، معاشی، علمی، سماجی اور قانونی معاملات میں وقت کے حاکم نظریات کی پیروی کو اپنا ذریعہ نجات سمجھا تو اجتہاد کا عمل خود بخود رک گیا۔

اجتہاد کی اسلامی روایت سے یہ انحراف ترقی و تجدید کے اس عمل کو، جو اسلام کی روح ہے اور جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن نے اجتہاد کے اصول کو مرکزی قرار دیا تھا، معطل کرنے کا باعث بنا۔ اس جمود و تعطل سے نجات کس طرح ہو؟ کیا اس کا حل مغربی فکر کو بنیاد بناتے ہوئے، اسلام کی تعلیمات میں سے ایک انتخاب کرنا ہے یا مسلمانوں کے ادوار ملوکیت و سلطانی میں اب سے سیکڑوں سال قبل تیار کیے گئے فتاویٰ اور قوانین کا اجرا و نفاذ کرنا ہے؟

ظاہر ہے کوئی شخص جو تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہو، اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کے بعض سلاطین اور ملوک کے دور کے فتاویٰ کو، جدید حالات و مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے جوں کا توں "نفاذ شریعت" کے عنوان سے نافذ کر دیا جائے۔ مسئلہ کا اصل حل اجتہاد کے مسنون اصول کو اس کی مکمل شکل میں اختیار کرنا ہے۔ یعنی اجتہاد کو محض چند ذاتی مسائل تک مقید و محدود نہ کر دیا جائے، بلکہ وسیع تر دائرہ کار میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

اجتہاد کا کلی طور پر اختیار کرنا، وہ کلیدی فکر ہے جسے بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات نے اپنی نظریاتی اساس قرار دیا۔ ان مسلمہ اسلامی تحریکات کی طرف سے تجدید و احیاے دین کی پکار ہو، ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت کا احساس ہو، یا اقامت دین کی دعوت، عملی طور پر جائزہ لے کر دیکھا جائے تو ان سب کی بنیاد میں یہ خواہش ایک طاقت ور جذبے کے طور پر نظر آتی ہے، کہ رضاے الٰہی کو پانے کے لیے زندگی

کے تمام معاملات میں روح اجتہاد کو اختیار کرنا چاہیے۔

اس خواہش کے اظہار کے لیے اسلامی تحریکات نے جو لہجہ اور زبان اختیار کی، وہ اسلامی ثقافتی روایت کی روشنی میں قرآن و سنت سے مستعار اصطلاحات پر مبنی ہے۔ یعنی، حاکمیت الٰہیہ کا قیام، تزکیہ نفس، تعمیر سیرت و شخصیت اسلامی، اصلاح اُسرہ و معاشرہ، فکری تطہیر، تزکیہ مال و اقتصاد، قیام حکومت اسلامیہ، عدل اجتماعی، متوازن معاشی ترقی اور معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض کی ادائیگی۔ لیکن اس کے برعکس مغرب زدہ ذہن اور مغربی سامراج نے اس کا مطلب یہی لیا کہ اسلامی تحریکات آنکھیں بند کر کے ایک ایسا انقلاب لانا چاہتی ہیں جس میں "ماضی" کی اقدار مثلاً دور مغلیہ، دور مملوک یا دور سلاطین میں رائج قوانین و فتاویٰ کو جوں کا توں نافذ کیا جا سکے۔

ہمارے خیال میں اجتہادی اسلامی تحریکات کے حوالے سے یہ اتنی ہی بڑی غلط فہمی ہے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جتنی مغرب کے بارے میں ہماری یہ غلط فہمی کہ مغرب میں پائی جانے والی ہر ہر فکر لازمی طور پر سرتاپا لادینیت، شرک اور عدم توازن کی علم بردار ہے۔ اس غلط فہمی کی اصلاح جتنی جلد ہو، اتنی ہی جانبین کے درمیان معقول و معتدل تبادلہ خیالات و رابطہ کے لیے مفید ہوگی۔ اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ ہے کہ کم از کم اسلامی تحریکات کے صحیح خدوخال خصوصاً جس پہلو کو ہم ان کا اجتہادی کردار کہتے ہیں، وضاحت سے پیش کیا جائے۔

۳

۲۰۰۰ء کی آمد کے موقع پر ایک مرتبہ پھر مستقبل میں اسلام کے کردار بالخصوص روایت اور جدیدیت کی بحث کو معاشی، سیاسی اور معاشرتی تناظر میں زیرگفتگو لایا جا رہا ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ ایک عالم پیر مر رہا ہے، اور ایک جہان نو پیدا ہو رہا ہے، جس کی اصل پہچان اس کا معاشی تفوق اور نظریاتی طور پر ثنویت (dualism) کی فتح ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس ثنویت میں معاشرہ اور مذہب دو ایسی قوتیں جو سابقہ دو صدیوں سے ایک بنیادی کردار ادا کر رہی تھیں، اب ان کی جگہ کچھ نئی اقدار کو لینا ہوگی:

> گذشتہ دو صدیوں سے مغرب اور ساری دنیا کی سیاست میں ریاست کے ذریعے انسان کے تمام مسائل کے حل کا تصور اہم ترین محرک رہا ہے۔ اس پر یقین اب ختم ہو چکا ہے۔ اس سے ایک خلا پیدا ہوا ہے۔ بنیاد پرست اسلام کا ظہور اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ مغرب کے جمہوری فلاحی مملکت کے تصور اور کمیونزم کی خیالی جنت کے سحر ٹوٹنے کا نتیجہ ہے۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹ اور pastroal گرجوں کا احیا درحقیقت کسی حد تک سیکولر ریاست کے ذریعے انسان

کے تمام مسائل کے حل کے تصور پر عدم یقین کا ردعمل ہے۔ ○

پیٹرڈرکر کے خیال میں مغربی اخلاقیات کے دو اہم بنیادی عناصر: مذہب اور معاشرہ اپنی تہذیبی عمر پوری کر چکے ہیں اور اب نئی صدی کے تناظر میں ایک نئے اخلاقی نظام نے اس خلا کو پُر کرنا ہے۔ مذہب خواہ وہ: عیسائیت ہو یا ہندوازم، یا بدھ ازم، اسے اپنے محدود روایتی کردار پر صبر کرنا ہوگا، کیونکہ ایک ایسے دور میں جہاں زمان و مکان کے تصور میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے، اس کے لیے اجنبی بن کر رہ جانا اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ خود یورپ میں مذہب کے کردار کو محدود کر دینے میں اس کی معاشرتی فکر (social thought) نے بھی بنیادی کردار ادا کیا اور وہ بہت سے کام جن کا تعلق روایتی مذہب سے تھا، اب معاشرے نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

چنانچہ ریاستی تعلیمی اداروں کے سرگرم عمل ہونے کے نتیجے میں ذاتی اور نفسیاتی معاملات، نکاح اور طلاق، عدالت اور تعلیم کے دائروں میں، روایتی مذہب کے بہت سے وظائف لادینی معاشرتی اداروں کے زیر تحویل آگئے۔ لادینی فلاحی ریاست کے تصور میں معاشرے کو وہ مقام حاصل ہوگیا جو کل تک مذہب کا حصہ تھا، اور اب یورپی انسان بڑی حد تک معاشرے کا بندہ بن گیا۔ معاشرے نے اسے ذاتی، سماجی اور معاشرتی معاملات میں لادینی، اخلاقی اور سماجی اقدار سے آراستہ کیا اور لادینی جمہوری سیاست کے ساتھ انفرادیت پسندی، اباحیت، لذتیت اور مادی ترقی و فلاح کو معاشرتی ترقی کی علامات قرار دیا۔

بیسویں صدی کے اختتام تک یہ اقدار یورپ و امریکہ کی ثقافت کی پہچان بن گئیں، لیکن بیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں کے باوجود معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں جتنا واضح انحراف بلکہ زوال رونما ہوا، اس کی مثال خود جدید انسانی تاریخ میں بھی نظر نہیں آتی۔ بیسویں صدی کی سب سے مہلک اخلاقی بیماری "ایڈز" نے معاشرے کے بعض بنیادی تضادات سے پردہ اٹھا دیا، جو شخصی آزادی، انفرادیت اور اخلاقی اضافیت (ethical moral relation) ایسے خوش نما اصولوں کے نام پر ایک فرد کو اپنی من مانی کرنے کے لیے تحفظ فراہم کرتے رہے۔ اخلاقی اضافیت کی بنا پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں عملاً ایک فرد کی اپنی خواہش اور حق و صداقت کی شخصی تعبیر زیادہ معتبر قرار پائی اور کسی مطلق سچائی، عدل اور حق کے تصور کو مکمل طور پر معاشرتی رواج کے تابع کر دیا گیا۔ فرد کے بنیادی حقوق اور شخصی آزادی کے نام پر اس اضافیت نے یورپ اور امریکہ میں سب سے زیادہ جس ادارے کو متاثر کیا، وہ مظلوم ادارہ خاندان کا ادارہ ہے۔

○ پیٹر ایف ڈرکر، "The New Realities in Government and Politics, in Business, Society and World"، نیویارک، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶

انسانیت کے تاریخی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ جب کبھی اور جہاں کہیں خاندان کا تقدس و احترام ختم کیا گیا، پھر اس معاشرے کو تباہی سے کوئی بڑی سے بڑی معاشی طاقت بھی نہ روک سکی اور ان معاشروں میں ویسی ہی مہلک بیماریاں پھیلیں جن کا ہم آج مشاہدہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ قوم لوط نے، جب بنیادی حقوق کے نام پر، آج کے gay rights (حق ہم جنسی) کی طرح اپنی بے راہ روی کو درست سمجھا، تو پھر قدرت حق نے دیگر اقوام کو ان کے مہلک زہر سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں مکمل طور پر تباہ کر کے نشانۂ عبرت بنا دیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر انسانیت کے مستقبل کے بارے میں یہ سوچنا ضروری ہے، کہ کیا فرد کی آزادی کے نام پر خاندان کے ادارے کو عملاً ختم کر کے اور اباحیت کو اختیار کر کے، مغربی تہذیب نئی صدی میں کوئی تعمیری کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ یا اس روبہ زوال تہذیب کی جگہ آفاقی، اخلاقی و الہامی اصولوں پر مبنی اسلامی تہذیب کو اس خلا کو پر کرنے کے لیے آگے بڑھنا ہو گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے اسلامی تہذیب کے ساتھ ٹکراؤ کی جگہ باہمی تعاون اور مفاہمت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اسلامی تحریکیں: جدوجہد کس طرح؟

راشد الغنوشی ○

محمد ظہیرالدین بھٹی

اختلاف رائے ایک فطری امر ہے‘وہ فطرت ‘ جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ (ھود ۱۱: ۱۱۸-۱۱۹) ”بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا‘ مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انھیں پیدا کیا تھا“۔ نیز فرمایا: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ (المائدہ ۵:۴۸) ”اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا‘ لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے“۔

انسان چوں کہ آزاد پیدا کیے گئے ہیں لہٰذا اختلاف رائے سے مفر نہیں۔ اختلاف کو سرے سے مٹا کر‘ زبردستی وحدت حاصل کرنے سے امتحان و ابتلا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس صورت میں انسان اپنے آزادانہ اختیار و ارادہ کو استعمال ہی نہیں کر سکتا۔ شریعت اسلامیہ نے اختلاف رائے سے نہیں تنازع و تفرقہ سے روکا ہے۔ نفس اختلاف سے روکنا تو امرمحال ہے‘ خلاف فطرت ہے۔ اختلاف رائے‘ انسانی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ جب کبھی سیاسی اور فکری آمریت کے ذریعے انسانوں کی اس فطرت کو دبانے کی کوشش کی گئی تو اس کے تلخ نتائج نکلے۔

○ تیونس کی تحریک اسلامی النہضۃ الاسلامیۃ کے قائد‘ جو ان دنوں برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تحریکی مسائل پر لکھتے ہیں۔ عرب دنیا خصوصاً تیونس کے تجربات پر ان کی گہری نظر ہے۔

اختلاف کا اعتراف کر کے' اس میں فکر و نظر سے کام لینا مطلوب ہے نہ کہ اس کا استیصال کرنا۔ اختلاف سے بحسن و خوبی نبٹنا مستحسن ہے تاکہ اختلاف رائے' حیات افروز اور مفید ثابت ہو نہ کہ تباہ کن۔ اختلاف رائے کو تسلیم کرتے ہوئے' احسن طریقے سے اس سے عہدہ برآ ہونے سے وحدت و یک جہتی قائم ہوتی ہے۔ یہ وحدت جبری نہیں ہوتی' رضاکارانہ ہوتی ہے۔ یہ رنگارنگی' تنوع اور تکمیل باہمی کی وحدت ہوتی ہے جس میں دوسروں کی خصوصیات کو تسلیم کیا جاتا ہے' ان کی نفی نہیں کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف سے نبٹنے اور عظیم اسلامی اصول "شوریٰ" کو اختیار کرنے میں کوتاہی کا آغاز ہماری امت کی تاریخ میں' اس دن سے ہوا تھا جب دین کو مقصد برآری کا ذریعہ بناتے ہوئے نیزوں پر قرآن شریف کو بلند کیا گیا تھا۔ "تقدیر" کا مفہوم بھی بدلا گیا اور امت پر مسلط کردہ صورت حال کو قانونی جواز دینے کے لیے' فتنہ کو اختلاف کے مماثل قرار دیا گیا۔ یعنی جو اقتدار پر کسی بھی طرح قابض ہو جائے' اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا جائے اور اسے قانونی تحفظ دے دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں' واقعاتی صورت حال سے' ایک طرح کا فرار اختیار کرتے ہوئے "بیماری" کا علاج "مرض" سے کرتے ہوئے' بعض حضرات نے' امت پر "وصی" مقرر کر دیے جانے کے نعرہ بلند کیا۔ امت کو مشاورت کا جو حق حاصل تھا' ان لوگوں نے یہ حق مکمل طور پر چھین لینا چاہا۔ انھوں نے امت کا معاملہ' امام غائب کے یا اس شخص کے حوالے کر دیا جو امام غائب کے نام پر حکومت کرے اور یہ باور کرا دے کہ کسی خاص وجہ سے امام غائب کے ساتھ اس کا رابطہ ہے اور وہ ان سے مدد لے رہا ہے۔ امت اسلامیہ کو شریعت اور شوریٰ کے ذریعے جو حق حکومت ملا تھا' ان حضرات نے یہ حق سلب کر لیا۔ اب امام غائب یا ان کے نمایندے کو ایک طرح کی "عصمت" یا "شبہ عصمت" مل گئی۔

امام غائب کے نمایندے میں' اور اس حکمران میں عملاً کوئی فرق نہیں جو اپنے آپ کو مشورے کرنے کا پابند تو سمجھتا ہے مگر مشورے کو اہمیت دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ "مشورہ کرنا" تو ضروری ہے مگر دیے گئے مشورے پر عمل درآمد ضروری نہیں۔ وہ ایک پلڑے میں پوری امت کو رکھتا ہے اور دوسرے پلڑے میں اپنے آپ کو' مگر اپنے پلڑے کو بھاری گردانتا ہے۔

ہماری امت نے جتنی کوتاہی' مشورے اور مذاکرات میں کی ہے' کسی چیز میں نہیں کی۔ یہی کوتاہی خلافت کے خاتمے کا سبب بنی۔ اسی وجہ سے امت ایک ایسے پُرخطر راستے پر جا پڑی جس کا لازمی انجام خلافت کا دروازہ مکمل طور پر بند ہونا تھا۔ امت کو ایسے بحرانوں سے گزرنا پڑا جنھوں نے منزل کھوٹی کر دی۔

انھی حالات کی بنا پر' امت کا یہ مزاج بن گیا کہ وہ غیر قانونی طور پر اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف خروج نہ کرے اور اسے ایک امر واقعہ سمجھ کر تسلیم کرے۔ تاہم یہ ضروری تھا کہ نیا حاکم احکام

شریعت پر عمل پیرا ہو، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ادارے کے ذریعے خرابیوں اور جرائم کی روک تھام کرے، رعایا کی بہتری کے لیے کام کرے۔ قومی فلاحی اداروں جیسے مساجد، مدارس اور جملہ سماجی خدمات کے اداروں کی، پہلے سے قائم اوقاف کے ذریعے مدد کرے۔ سماجی خدمات کی بہتات سے جب عوام کی حاجات و ضروریات پوری ہو رہی ہوتیں تو وہ بڑی حد تک حکمرانوں سے بے نیاز ہو جاتے۔ البتہ دو کام ایسے تھے جو بہرحال حکمرانوں کو ہی سرانجام دینا تھے اور ان کے لیے امت کو حکومت کی جانب ہی دیکھنا ہوتا تھا۔

مسلح جہاد، جمہور مسلم علما کے نزدیک صرف اس وقت جائز ہے جب کوئی بیرونی دشمن دین، مسلمانوں اور مسلم علاقوں پر حملہ آور ہو۔ زبردستی اقتدار پر قابض ہو جانے والے طالع آزماؤں کے خلاف مسلح جدوجہد، جمہور علما کے نزدیک کبھی پسندیدہ عمل نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ علما کا یہ طرز عمل منفی تھا۔ اس سے جابر و سرکش حکمرانوں کو موقع مل جاتا تھا کہ وہ داعیان اسلام پر ستم کرنے میں جری ہوں، حرمتوں اور حقوق کو پامال کریں اور آزادیاں سلب کر لیں۔

مسلمانوں کی طویل تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں مسلم علما کی اکثریت کا یہ طرز عمل اگرچہ آئیڈیل--- درست ترین اقدام --- نہ تھا، ان کے اس عمل پر نکتہ چینی بھی ہوتی رہی ہے، تاہم، یہ رویہ امت کے لیے کم نقصان دہ ضرور ثابت ہوا ہے۔ اس کے برعکس، سرکش حکمرانوں کے خلاف جاں بازی، معرکہ آرائی اور انھیں مباح الدم قرار دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، جب تک بہت سے بے گناہ لوگ مارے نہ جائیں، عوامی مفادات تباہ نہ ہو جائیں، اور امت کے دشمنوں کی مداخلت کے لیے، امت کی کمزوری کے کئی راستے نہ کھل جائیں۔

اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ قابض و مسلط حکام کا قلع قمع کر دینے، اور جان و مال کی اتنی عظیم قربانیاں دینے کے باوجود، تجربے سے ثابت ہے کہ پیش نظر مقصود پھر بھی شاذو نادر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مسلط حکمرانوں کے خلاف، عوام کے ہتھیار اٹھا لینے کے بعد، اگر کہیں حکمران اقتدار سے دستبردار ہوئے بھی ہیں تو پہلے سے بڑا ڈکٹیٹر سامنے آتا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہم ظالم و جابر حکمرانوں کے آگے سرتسلیم خم کر دیں۔ بلاشبہ ستم گر حکمران کا مقابلہ کرنا ایک مقدس شرعی فریضہ ہے۔ انبیا کرام کی بعثت کا ایک مقصد دنیا میں قیام عدل بھی ہے۔

دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے، وہ عظیم ہتھیار استعمال کیا جائے جو اسلام نے ہر مسلمان کو، حسب حالات انفرادی و اجتماعی طور پر عطا فرمایا ہے۔ یہ ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ اس ہتھیار سے لیس ہو کر، ہم اس طرز عمل سے بچ سکتے ہیں جسے تاریخ اسلام کے طویل دور میں، خوارج اور

ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اختیار کیا اور آئے دن کی خونریزیوں اور بحرانوں سے مسلمانوں کی زندگی کو اجیرن بنا کے رکھ دیا۔ خوارج کے ان اقدامات سے مسلمانوں کو خیر و صلاح ملی، نہ ظلم سے نجات۔

افراتفری کی اس کارروائی سے ہٹ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنا لینا یقیناً رشد و بصیرت کا کام ہے۔ اس سے ہم جہاد کے مختلف مدارج و مراتب میں سے مناسب درجے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وَحَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَفْهَمُوْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهٗ "لوگوں کے فہم کے مطابق بات کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو جھٹلایا جائے؟"--- عربی کا محاورہ ہے: لکل مقام مقال، یعنی بات موقع محل کے مطابق ہو۔ چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا ہی دانش مندی ہے۔ گڑبڑ، فتنہ و فساد اور انارکیت سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ "اسلامی جہاد" کا اصول اپنایا جائے اور اس میں تدریج کو ملحوظ رکھا جائے۔ سب سے افضل جہاد، کلمہ حق ہے۔ جہاد الکلمۃ ہی امت کے داخلی اختلافات سے نبٹنے کا واحد جائز طریقہ ہے۔

حالات کی تبدیلی کو درست طور پر سمجھ نہ سکنے کا ایک سبب "مملکت" کے ادارے کو سمجھنے میں کمزوری ہے۔ مملکت اور امرواقعہ کو سمجھنے میں یہ کمزوری دراصل نتیجہ ہے اسلاف کی اندھی تقلید کرنے اور یونانی قیاسی منطق سے متاثر ہونے کا۔ امرواقعہ اور زمینی حقائق سے یونانی منطق کا کچھ تعلق نہ تھا اور اسلاف کے مسائل و ضروریات سادہ تھے۔ یونانی منطق سے اثرپذیری کا نتیجہ ہے کہ کئی فقہی قوانین و قواعد صورت حال سے مجرد ہیں۔ نیز عقلی عمل، صرف نظریاتی دعووں میں کارفرما ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ عقل، شریعت اور صورت حال کی تکون بنے۔

قیاس کی حکمرانی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی نئی صورت سامنے آتی، نیا مسئلہ پیدا ہوتا، تو علما نصوص اور اسلاف کے فتاویٰ و اقوال کی طرف لپکتے تاکہ وہ قیاس کرنے کے لیے کوئی ملتا جلتا واقعہ ڈھونڈ سکیں۔ چونکہ نصوص اور اقوال سلف بھی وقائع کی مانند متعدد ہوتے ہیں اور ان میں بظاہر اختلاف ہوتا ہے، اس لیے متلاشی حضرات بھی اپنے پیش نظر نصوص پر عمل پیرا ہو کر، دوسروں سے اختلاف کرتے۔ اسی طرح اسلاف کی تاریخ کے واقعات، جن پر قیاس کیا جاتا ہے، مختلف ہوتے ہیں۔

ظالم حکمرانوں کے خلاف، خروج کے حامی علما، ان آیات سے استدلال کرتے تھے جن میں قتال کا ذکر ہے۔ وہ اپنے موقف کی تائید میں سلف کے اعمال اور اولین فقہا کی آرا پیش کرتے--- جن کی رو سے جہاد کرنا، اور اگر جہاد کی طاقت نہ ہو تو کم از کم جہاد کی تیاری کرنا--- شرعی فریضہ ہے۔ جہاد یا اس کی تیاری سے منہ موڑنا بھاری گناہ ہے جس سے مسلمان، ملت اسلامیہ سے نکل جاتا ہے۔ یہ حضرات آیات قتال اور فتاویٰ اسلاف سے استشہاد ضرور کرتے مگر ان آیات کو نظرانداز کر دیتے جن میں حکمت اور موعظت حسنہ

کے ساتھ اپنے رب کی طرف بلانے کا حکم ہے۔ ان آیات میں صبروبرداشت کا حکم دیا گیا ہے اور خروج کرنے والوں کو فتنہ جو قرار دیا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خروج کے داعی اگر کامیاب ہو جاتے تو علما ان کے اقتدار کو بھی "امرواقعہ" سمجھ کر جائز تسلیم کر لیتے اور ان سے صرف وہی مطالبات کرتے جو سابقہ حکمرانوں سے کرتے تھے۔

جب تک "صورت حال" یا "امرواقعہ" کے اساسی عنصر اور فیصلہ کن توازن کا غور سے جائزہ نہ لے لیا جائے، معروضی حالات و ظروف کی حقیقت کو سمجھ نہ لیا جائے، حالات کی نبض پر ہاتھ نہ ہو، تغیرو تبدل کے مواقع کا پوری باریک بینی سے جائزہ نہ لے لیا جائے اور پھر اس نتیجے پر نہ پہنچا جائے کہ ہمیں جدوجہد کس سطح پر کرنی ہے؟ ہماری استطاعت کیا ہے اور امکانات کیا ہیں؟ کبھی اقدام درست نہیں ہو سکتا۔

"استطاعت" کا عنصر ہی وہ چیز ہے جسے شارع نے متعین فرمانے میں، کسی متعین منکر کے ازالے کے سلسلے میں، ذرائع و وسائل کے اختیار کرنے میں فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴:۱۶) "لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرتے رہو"۔ نیز فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط (البقرہ ۲:۲۸۶) "اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا"۔

صاحب الدعوۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: جو کوئی تم میں سے برائی دیکھے اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کرے، اگر اس کی استطاعت نہیں تو پھر اپنی زبان سے، اور اگر اس کی استطاعت نہیں تو اپنے دل سے اور یہ کمزور ترین ایمان کا مظہر ہے (مسلم)۔ گویا اس ارشاد کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منکرات کے ازالے کے لیے، شر کے ہٹانے کے لیے، ناپسندیدہ عناصر کا قلع قمع کرنے کے لیے، حالات کی تبدیلی کے لیے مسلمانوں کے سامنے کئی راستے رکھ دیے ہیں تاکہ وہ خود، پیش آمدہ صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لے کر، حالات و امکانات کو سامنے رکھ کر، مناسب اور موزوں قدم اٹھائیں۔ شارع نے اسے مسلمانوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے اور کسی خاص اقدام کا تعین نہیں فرمایا۔

قرآن و سنت "استطاعت" کی قید لگاتے ہیں اور فردوجماعت کو "پیش آمدہ صورت حال" سمجھنے کا پابند کرتے ہیں۔ صورت حال کو سمجھنا کوئی معمولی کام نہیں، اس کے لیے خاص علوم کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے عمرانیات، اقتصادیات، شماریات، سیاسیات، تاریخ، فلسفہ وغیرہ وغیرہ۔ ان علوم میں مہارت حاصل کرنے سے ہم اپنی سیاسی فکر کی خامیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

ہماری پس ماندگی اور ہماری امت کی بہترین صلاحیتوں اور عظیم قربانیوں کے ضیاع کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم صورت حال یا امرواقعہ کو درست طور پر سمجھ نہ سکے۔ تغیرو تبدل کا جذبہ اپنی جگہ نہایت مستحسن

ہے' لیکن اس کے لیے مناسب و موزوں وقت کی پہچان بھی بہت ضروری ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہماری امت نے' اپنے عقیدہ کی خاطر' جان و مال کی جتنی بڑی قربانیاں دی ہیں' کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

ہمارا یہ ملی المیہ رہا ہے کہ ہم نے ہمیشہ حالات کا درست اندازہ لگانے میں کوتاہی برتی ہے۔ اس سلسلے میں عقل و فہم کا مناسب استعمال نہیں کر پائے۔ ہم نے افرادی و مادی وسائل کے استعمال میں کمزوری دکھائی ہے۔ اپنے اور دشمن کے امکانات کا موازنہ کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ ترجیحات کی ترتیب و تعیین میں ضعف دکھایا ہے۔ مخالفین کی درجہ بندی نہیں کر سکے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم دوستوں کی تلاش جاری رکھیں' اپنے دشمنوں میں کمی کریں' قربانیاں دینے میں اعتدال کا رویہ اپنائیں' کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے عواقب و ثمرات پر اچھی طرح غوروفکر کر لیں' تجربات سے سبق حاصل کریں' مشاورت و شوریٰ کا دائرہ وسیع کریں۔ ماہرین و متخصصین کا احترام کریں اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کریں' ہر ایک کی صلاحیت و استعداد کے مطابق اسے ذمہ داریاں سونپیں۔ امت کی قوتوں کو یکجا کرنے کے لیے عدل قائم کریں۔ اپنے اندر صبروبرداشت کی قوت پیدا کریں اور غیر ضروری معرکہ آرائیوں سے اجتناب کریں۔ اعلیٰ مقاصد سے لگن پیدا کریں' حسن خلوص سے آراستہ ہوں۔

ہمیں چاہیے کہ آنے والی نسلوں کے لیے عمدہ نمونہ چھوڑیں۔ ہمارے لیے اور آیندہ مسلمان نسلوں کے لیے کامیابی کا واحد راستہ یہی ہے کہ پیش آمدہ صورت احوال کا تدبر و تفکر سے جائزہ لیں--- یہ حالات خواہ مقامی ہوں یا بین الاقوامی--- تغیرو تبدل کے لیے مہیا امکانات و وسائل کا درست جائزہ لیں اور جلدبازی اور اثرپذیری سے بچ کر رہیں۔

جن بحرانوں سے ہم اب تک گزرے ہیں کیا ان کے تلخ نتائج ہمارے لیے اپنے اندر کافی سامان عبرت نہیں رکھتے؟ ہم لوگ صاحب دعوت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ حسنہ کی پیروی کب کریں گے جسے اپنانے کا حکم آپؐ کو ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۲:۱۰۸)

تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

حج : غلبہ اسلام کا پیغام

امام حسن البنّاؒ کا منیٰ میں خطاب

ترجمہ: محمد احمد زبیری○

۱۳۵۴ھ' مارچ ۱۹۳۶ء کے حج کے موقع پر ''الشباب العربی السعودی'' نے منیٰ میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں امام حسن البنّاؒ اور کچھ دوسرے خطیبوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریر کو اخبار ام القریٰ نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ کو شائع کیا۔ اس نادر دستاویز کی مائیکروفلم جامعہ ملک فہد ذہران میں موجود ہے۔ ہم اس کا ترجمہ تذکیر اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں (ادارہ)۔

میرے معزز بھائیو!

میں آپ کی اجازت سے اپنی گفتگو کا آغاز' اللہ تعالیٰ کے مسلمانوں سے خطاب سے کرنا چاہتا ہوں:

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے' شاید کہ ان علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳)۔

اسی مناسبت سے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی سنانا چاہتا ہوں:

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا (الحجرات ۴۹:۱۰)۔

○ ریسرچ اسکالر' دعوہ اکیڈمی' اسلام آباد

اسلام کا بہترین ہدیہ، سلام آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں: السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! میں کوئی پیشہ ور خطیب نہیں ہوں لیکن الشباب العربی السعودی نے حجاج کرام کو باہمی تبادلۂ خیالات اور تعارف کا یہ موقع فراہم کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اجر سے نوازے۔ میں سمجھتا ہوں باہمی تعارف اور تبادلۂ خیالات حج کی تکمیل کا حصہ ہے۔ آپ سے مخاطب ہونے کا جذبہ، پرجوش اور مفید تقریریں سننے کے بعد ابھرا ہے۔

معزز نوجوانو! میں آپ کی تعریف میں وقت صرف نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی مہمان نوازی کا تذکرہ بھی نہیں کروں گا بلکہ ہم اپنی امیدوں اور مسائل کے حوالے سے گفتگو کریں گے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں گے۔ آپ سے محبت اور شیفتگی پہلے بھی تھی لیکن اب یہ ایک ناقابل تردید حقیقت بن چکی ہے۔ اس محبت کو اللہ تعالیٰ کا یہ مبارک ارشاد انگیز کرتا ہے:

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جاے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو (البقرہ ۲: ۱۲۵)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب حضرت عائشہ صدیقہؓ نے مکہ مکرمہ کا ذکر کیا تو اس کی خوب صورتی اور رعنائیوں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں تر ہوگئیں اور کہا ذرا دل کو قرار پکڑنے دو، اور اس تذکرے کو سمیٹو۔ مکہ پر حضرت بلالؓ کے اشعار بھی یاد آتے ہیں۔

ہم بچپن سے یہ سارے تذکرے سنتے آئے ہیں۔ انھوں نے آتش شوق کو مزید تیز کر دیا۔ ہم ہمیشہ اس مبارک دن کے انتظار میں رہے جب ہم مکہ مکرمہ کی زیارت سے فیض یاب ہوں گے اور خیف میں کھڑے ہوں گے، مجنوں کی لیلیٰ کے شوق میں نہیں، ہر ایک کی اپنی لیلیٰ ہوتی ہے۔ اب یہ آپ کی محبت ہمیں یہاں لے آئی ہے۔ آپ کی محبت کوئی افسانوی چیز نہیں بلکہ یہ ایک قابل محسوس حقیقت ہے۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے اس تعلق اور رابطے کو بھلائی اور برکت کا سرچشمہ بنائے۔ آمین!

معزز نوجوانو! آپ کے پہلے خطیب نے یہ کہا کہ اسلام دین اور دنیا کے مصالح اور بھلائیوں کو جمع کرتا ہے۔ یہ ایک مانوس اور قابل مشاہدہ حقیقت ہے۔ آپ چشم تصور سے نماز پر غور کریں۔ تمام اعمال کا مغز اور پاکیزہ ترین عمل ہے۔ آپ کی یہ عبادت قرآن کی تلاوت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ آپ اپنے رب سے سرگوشی میں مصروف ہیں۔ اللہ کا قرآن آپ سے کیا کہہ رہا ہے؟ (یہاں امام حسن البناؒ نے سورہ البقرہ کی آیات (۲۸۱-۲۸۳) تلاوت کیں جن میں لین دین کے معاملات لکھنے اور انصاف سے معاملات کرنے کا حکم دیا گیا ہے)۔

اسی طرح قرآن آپ سے مخاطب ہے کہ تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ یہ دین کے اٹل اور قطعی معاملات ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ رزق کی تلاش اور کسب حلال میں مصروف ہیں جو دنیاوی کاموں میں سرفہرست ہیں۔ اس سلسلے میں رسولؐ اللہ کا یہ فرمان آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس انسان سے محبت کرتا ہے جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہے۔ اور یہ کہ جو شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا ہے وہ اپنی بخشش کا سامان کرتا ہے۔ دیکھیے رزق حاصل کرنا اور روزی کمانا دنیاوی کام ہے لیکن یہ آخرت کے کاموں سے مربوط ہے اور نجات اور مغفرت کا سبب بن رہا ہے۔

شریعت کے ہر گوشے میں دین اور دنیا کا گہرا تعلق آپ کو نظر آئے گا۔ لیکن مسلمان دین کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہیں۔

آپ کے دوسرے خطیب نے حجاز کی ترقی کی بات کی۔ اگرچہ یہ ترقی اور پیش رفت اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن یہ ابتدائی مراحل اور خدوخال ان شاء اللہ نمایاں نقوش میں بدل جائیں گے۔ فطرت کا یہی قانون ہے' جیسا کہ شاعر نے کہا: جب میں نے ہلال کو روز افزوں دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دن ماہ کامل بن جائے گا۔

ترقی اور انقلاب کی باتیں خوش آیند ہیں اور اس سلسلے میں مزید کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ امیدیں اور تمنائیں آپ کے چہروں پر پڑھی جاسکتی ہیں اور زبانوں پر اس کا تذکرہ ہے۔ ترقی اور انقلاب امید سے زندہ رہتے ہیں اور ناامیدی اور یاس اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ زندگی میں ناامیدی کا کوئی عمل دخل نہیں' ناامیدی اور زندگی کا ساتھ نہیں رہ سکتا۔ آج کے زندہ حقائق کل تک محض خواب تھے اور آج کے خواب مستقبل کے زندہ حقائق ہوں گے۔ جسے مہلت ملی ان شاء اللہ ضرور دیکھے گا۔ تنگی کے ساتھ فراخی ہے اور بے شک تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ اللہ تعالیٰ مایوسی اور ناامیدی کو اپنی کتاب میں حرام قرار دیتا ہے:

> میرے بچو' جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں (یوسف ۱۲: ۸۷)۔

یہ حالات قوموں کو پیش آتے رہتے ہیں لیکن صورت حال ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی' کمزور طاقت ور بن جاتے ہیں اور زبردست زیردست بن جاتے ہیں:

> اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں' اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں (اٰل عمرٰن ۳: ۱۴۰)۔

جو شخص اس آیت کی تلاوت کرے اور غور و فکر سے کام لے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ا　 کی طاقت کے لیے کوشاں نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ امم اور اقوام کے حالات کو کس طرح بدل دیتا ہے' اور اس کا عدل مظلوم کا ظالم سے کیسے بدلہ لیتا ہے' اور سرکشی اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو حق داروں کا حق دلوانے پر کس طرح مجبور کرتا ہے' سورۃ القصص کی یہ آیات تلاوت کیجیے' ان میں اسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے:

واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انھیں پیشوا بنا دیں اور انھی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انھیں ڈر تھا (القصص ۲۸:۴-۶)۔

یہ کتاب ابدی کا ابدی حکم ہے۔ اگر یہ ماضی میں ہو سکتا ہے تو مستقبل میں کیوں نہیں ہو سکتا:

دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۹)۔

آپ کے تیسرے خطیب نے کہا کہ ترقی اور تعمیر و ترقی کی بنیاد اور اساس اسلام ہے۔ اللہ کی طرف دعوت اور اسلام کی نشات ثانیہ سے یہ ہدف حاصل ہو سکتا ہے۔

میرے بھائیو! تم حقیقت کا ادراک کر چکے ہو اور ہدایت کی طرف رہنمائی پا چکے ہو۔

میں اس موقع پر' آپ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ سے میری محبت اور شفقت کا لازمی تقاضا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد مشرق ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک راستہ مغربی تہذیب و تمدن اور اس کی اندھا دھند تقلید کا ہے اور دوسرا راستہ مشرقی تہذیب و تمدن اور اسلام کی نشات ثانیہ کا ہے۔ دونوں راستوں پر اس کے حامی لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں' ترغیب دے رہے ہیں' اور اپنے اپنے نظام کے قصیدے پڑھ رہے ہیں: بعض مشرقی اقوام مغرب کی تقلید میں ان سے بھی سبقت لے گئیں اور بعض اقوام نے مزاحمت کا رویہ اپنایا لیکن بعض مغرب کی ترقی کو چندھیائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ خواہش نفس اور اتباع ھویٰ انھیں مغرب کے قریب کر رہی ہے' اور ایمان انھیں دوسری سمت میں کھینچ رہا ہے۔ ایک صالح گروہ جو اپنی دینی روایات اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چل رہا ہے وہ اپنی مشرقی اور عربی اقدار پر نازاں ہے۔

امت مسلمہ کی یہ حالیہ تصویر ہے۔ عرب نوجوانوں سے ہماری توقع اور امید ہے کہ وہ یہ سبق سیکھ لیں گے کہ اسلام کامل دین ہے اور دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ انسانوں کی سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ انسانوں کی تمام مشکلات اور مصائب کا واحد حل اسلام ہے۔ عنقریب اس حقیقت کو ساری دنیا جان لے گی۔ انسانیت کا گلا خشک ہو چکا ہے اور اس کے حلق میں شک اور الحاد کے کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پیاسی انسانیت کی پیاس صرف اور صرف کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے چشمہ صافی بجھ سکتی ہے۔

اسلام کی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالو اور اپنی روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے رکھو۔ ساری دنیا کو یہ باور کرادو کہ تم حق پر ہو اور دوسرے لوگ شک و شبہ کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ کتاب اللہ کو اپنے درد کا درماں بناؤ، وہ دلوں کی بیماریوں کے لیے پیغام شفا ہے۔ تڑپتی اور سسکتی انسانیت کے سامنے اللہ کا دین پیش کرو۔ نت نئے افکار کی دل فریبیوں سے بچو اور شیطان اور نفس کے دام فریب سے اپنا دامن بچاؤ۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین تبدیل نہیں ہوتے:

> اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے۔ اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنھیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے (الرعد ۱۳:۱۷)۔

اسلام میں مقاصد اور ذرائع الگ الگ ہیں۔ اس اصطلاح کی کئی ایک تعبیریں ہوسکتی ہیں۔ آپ میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام کی طرح ان کی تعبیر و تاویل کرسکتا ہے۔ یہ معاملہ تفصیل طلب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کافی ہے: خدا کی قسم! کوئی بھلائی ایسی نہیں ہے جس کے کرنے کا میں نے تمھیں حکم نہ دیا ہو اور کوئی شر ایسا نہیں ہے جس سے باز آنے کا میں نے نہ کہا ہو۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا:

> (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں (الاعراف ۷:۱۵۷)۔

اے عرب نوجوانو! اپنے آپ کو حقیر نہ جانو اور نہ اپنے مقصد کو کم تر سمجھو کیونکہ آپ کو دنیا کی قیادت سنبھالنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی امانت انسانیت کو پہنچانی ہے۔ آج آپ شور وغوغا سن رہے ہیں کہ جرمن عظیم قوم ہے' اٹلی کا کوئی مدمقابل نہیں' برطانیہ سب سے عظیم ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان کے جھوٹے دعوے ہیں تاکہ اس کے ذریعے وہ کمزوروں کو تر نوالہ بنا سکیں۔

اے اسلام کے سپاہیو! تم ان القاب اور اوصاف کے زیادہ حق دار ہو۔ اگر تم یہ دعویٰ کرو تو یہ بے جا اور خالی خولی دعویٰ نہ ہوگا بلکہ یہ ایسی حقیقت ہے جو قیامت تک قرآن مجید میں محفوظ ہے:

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو ان ہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیش تر افراد نافرمان ہیں (آل عمرٰن ۳:۱۱۰)۔

یہ اس لیے نہیں کہ تم کمزوروں پر دست ستم اٹھاؤ یا پرامن لوگوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناؤ بلکہ تمھارا مقصد نیکی اور بھلائی کی تلقین کرنا ہے۔

میرے بھائیو! مجھ پر اعتماد کرو' جب میں عربوں کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرے پیش نظر وہ محدود مفہوم نہیں ہوتا جو جغرافیائی بندشوں میں مقید اور جکڑا ہوا ہوتا ہے بلکہ میں اس لفظ کو وسیع مفہوم میں استعمال کرتا ہوں جو پوری روے زمین کے مسلمانوں پر محیط ہے۔

اے نوجوانو! اللہ تعالیٰ نے آپ کے نبیؐ کو تمام انسانیت کے لیے معلم بنا کر بھیجا ہے اور انھوں نے یہ امانت آپ کے سپرد کر دی ہے۔ آپؐ نے جس کام کا آغاز فرمایا تھا' اسے تکمیل تک پہنچانا اب آپ کا فریضہ ہے۔ اب آپؐ انسانیت کے معلم اور راہنما ہیں۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہو اور آپؐ کے بعد روشن نشانیوں والے صحابہ کرامؓ کے وارث ہو۔ بعض لوگ روشن چراغ ہوتے ہیں گویا کہ وہ حقیقی ستارے ہیں۔ ان کا اخلاق' ان کا اجالا اور روشنی ہے۔ ان کے اخلاق کا جادو ہر سمت میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان کی پیروی کیجیے اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہیے۔ ان کی میراث اور عظمت رفتہ کو از سر نو زندہ کیجیے۔ اللہ کی تائید تمھارے ساتھ ہے۔

مصر کے نوجوانوں کے دل تمھارے دلوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور ان کے جذبات اور احساسات تمھارے جذبات سے مختلف نہیں۔ وہ تمھارے اس جہاد میں شریک ہوں گے' یا منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے یا اس راستے میں جان نچھاور کر دیں گے!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

پاکستانی معاشرے کی مزاجی کیفیت

عبدالکریم عابد°

معاشرے کا جب صحت مندانہ ارتقا ہو رہا ہو تو اس کی ایک سمت ہوتی ہے اور مختلف تبدیلیوں کی نوعیت میں ایک ترتیب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ پاکستانی معاشرے کی تبدیلیاں اس نوعیت کی نہیں ہیں۔ کیونکہ معاشرہ مزاجی ہم آہنگی کھو چکا ہے' اس لیے وہ متضاد سمتوں میں جا رہا ہے اور اس سے معاشرے کی تقسیم اور ٹکراؤ کا عمل شدید ہوتا جائے گا۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور عالم مقدمہ تاریخ میں لکھا تھا کہ معاشرے کی وحدت ایک عصبیت کا نتیجہ ہوتی ہے' جو افرادِ معاشرہ میں مشترک ہوتی ہے۔ جب تک یہ عصبیت برقرار رہتی ہے' معاشرہ اور اس کی ریاست قائم رہتی ہے۔ لیکن جب یہ کمزور تر ہوتی چلی جائے تو آخر شیرازہ بکھرنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

مسلم قومیت کا احساس: پاکستانی معاشرہ اور ریاست کو وجود میں لانے کی عصبیت' مسلم قومیت کا احساس تھا لیکن مسلم قومیت کی یہ عصبیت اس وقت انتہائی کمزور حالت میں ہے۔ اس کی جگہ لسانی عصبیتیں لے رہی ہیں۔ اگرچہ معاشرے میں فرقہ وارانہ عصبیت نے بھی اپنا اظہار کیا ہے' لیکن یہ افراد معاشرہ میں عام نہیں ہے۔

فرقہ وارانہ عصبیت: فرقہ پرست تنظیموں اور ان کے مسلح گروہ یا دہشت گرد کارروائیاں کرتے رہے ہیں' لیکن ایک پاکستانی مسلمان کی سوچ پر فرقہ وارانہ رنگ غالب نہیں ہے۔ ویسے ہر فرقے میں اس کی اپنی ایک عصبیت ضرور ہوتی ہے' لیکن سنی' شیعہ' دیوبندی' بریلوی کسی فرقے کے افراد میں یہ عصبیت ایسی غالب نہیں ہے کہ عام فساد کی شکل اختیار کر جائے۔ درحقیقت فرقہ واریت کے خون آشام مناظر کسی عوامی لہر کی نمایندگی نہیں کرتے۔ یہ بعض انتہا پسند تنظیموں کی کارستانی تھی اور ان خون آشام مناظر کو دیکھنے کے بعد عوام میں

° چیف ایڈیٹر' ہفت روزہ 'فرائیڈے اسپیشل' کراچی

فرقہ واریت کے خلاف ذہن پیدا ہوا ہے کہ مسجدوں، امام بارگاہوں کے فرش کو خون سے رنگین کر دینا کسی مسلک اور فرقے کی خدمت نہیں ہے اور ان واقعات نے فرقہ واریت کے خونی اور جنونی انداز کے خلاف ذہن پیدا کیا ہے۔ فرقہ پرست تنظیموں کے لیڈروں نے بھی سوچا ہے کہ اگر ایک دوسرے کے فرقے کے ممتاز افراد کے قتل کا سلسلہ جاری رہا، تو اس کی زد میں ہم بھی آسکتے ہیں۔ ان تنظیموں کو پہلے انتظامیہ کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت جو شہ حاصل تھی، وہ بھی اب انھیں حاصل نہیں ہے۔ عراق، ایران جنگ کے زمانے میں جو بیرونی شہ تھی، وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ مشرق وسطیٰ میں ایک عرب عجم مفاہمت کا ارتقا ہوا ہے۔ تاہم پچھلے دنوں شیعہ سنی فرقہ واریت میں کمی ہوئی ہے، تو دیوبندی بریلوی جھگڑے نے بعض گوشوں سے سر اٹھایا ہے، لیکن یہ بھی عوام کے کسی موڈ کا نتیجہ نہیں۔ اس کے پیچھے سیاست ہوسکتی ہے یا بعض گروہوں کے جھگڑے، اور ان کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ یہ کوئی بڑا فساد پیدا کرسکیں۔ اگرچہ بھارت کی کوشش ہے کہ پاکستان فرقہ وارانہ جنگ و جدل کا اکھاڑہ بن جائے۔ اس کے لیے اس کے ایجنٹ بھی کام کرتے ہیں، لیکن پاکستانی معاشرے میں فرقہ واریت محدود دائروں میں ہی ہے اور اس سے کسی جنگ و جدل کا اندیشہ نہیں ہے اور نہ لوگوں کا مزاج فرقہ وارانہ لڑائی کا ہے۔

لسانی عصبیتیں: فرقہ وارانہ عصبیت کے مقابلے میں لسانی عصبیتیں مزاج پر حاوی نظر آتی ہیں اور ان عصبیتوں سے کوئی بھی لسانی گروہ خالی نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس عصبیت نے پاکستان بنایا تھا وہ ختم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ کسی نہ کسی عصبیت کو لینا ہے اور حالات لسانی عصبیتوں کے لیے سازگار ہیں۔ سندھ، کراچی، بلوچستان، سرحد، پنجاب اور اس کا سرائیکی علاقہ سب عصبیتوں کی لپیٹ میں ہیں اور ان کا اثر آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ لسانی عصبیت کی حامل سیاسی جماعتوں سے قطع نظر بیوروکریسی میں بھی اس کی مضبوط جڑیں قائم ہو چکی ہیں۔ کالا باغ ڈیم بنانے یا نہ بنانے کا مسئلہ ہو، پانی کی صوبوں میں تقسیم کا معاملہ ہو، یا صوبوں کے وسائل کے حق کا معاملہ ہو، ان سب کو عصبیت کی عینک سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایک طرف تمام چھوٹے صوبوں کے عوام میں یہ بات متفق علیہ ہوگئی ہے کہ پنجاب ہم سے زیادتی کرتا رہا ہے اور مزید کر رہا ہے۔ دوسری طرف پنجاب کے عوام کا عام احساس یہ ہے کہ چھوٹے صوبوں کی بیوروکریسی اور ان کی سیاسی قیادت خواہ کسی جماعت کی ہو، اس کا رویہ عدم تعاون کا ہے اور یہ عدم تعاون صرف تعصب کی بنیاد پر ہے۔

ملک میں صحت مند سیاست اور قیادت کا غلبہ نہ ہونے کے سبب آیندہ اس لسانی عصبیت کے مزاج کے ترقی کرنے اور باہم متصادم ہونے کے کافی امکانات ہیں۔ چونکہ ملک کے معاشی حالات بھی دگرگوں ہو رہے ہیں اور عوام کے لیے روزگار کی صورت حال بدتر ہو رہی ہے، اس لیے معاشی مصائب کے لیے بھی ایک

دوسرے کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ جب معاشی حالات اچھے ہوتے ہیں تو ہر گروہ مطمئن رہتا ہے' لیکن جب یہ بگڑتے ہیں تو اس کا اثر قومی وحدت پر بھی ہوتا ہے' اور کسی جوڑنے والے نظریہ کی عدم موجودگی میں شکست و ریخت اور توڑنے والی قوتوں کو نفرت انگیزی کے لیے مواقع مل جاتے ہیں۔ آیندہ ہمارے معاشرے کو اس صورت حال کا بھی سامنا رہے گا۔

پاکستانی معاشرے میں پچھلے دو تین عشروں میں دو متضاد چیزوں کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ہے۔ ایک مذہبیت ہے' دوسری عریانیت و فحاشی۔ پہلے ہم مذہبی مزاج کا تجزیہ کریں گے۔

مذہبی رجحان: ہمارے معاشرے میں مذہبی رجحان کا ایسا زور و شور نظر آتا ہے کہ جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ پہلے صرف تبلیغی جماعت کی مقبولیت تھی' جو اب اور زیادہ ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ''دعوت اسلامی'' اور اسی طرح کی تحریکوں نے نچلے متوسط طبقے اور چھوٹے تاجروں اور کاریگروں کے طبقے میں خاص نفوذ حاصل کیا ہے۔ جو مذہبیت جڑ پکڑ رہی ہے' وہ غیر سیاسی ہے اور سیاسی بھی ہے۔ سیاست کے میدان میں جہادی قوتیں منظم حالت میں ہیں۔ افغانستان اور کشمیر میں کامیاب معرکہ آرائیوں کے مظاہرے کے بعد وہ پاکستانی سیاست میں جارحانہ کردار ادا کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ لیکن یہ عناصر چھوٹی چھوٹی تنظیموں میں بکھرے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کر کے چلنے کی صلاحیت ان میں نظر نہیں آتی ہے۔ کئی تنظیموں میں کسی گہری سوچ بچار کے بجائے عام جذباتیت غالب نظر آتی ہے' جو چوراہوں پر ٹی وی توڑ کر یا اس طرح کے سطحی مناظر سے مطمئن ہونا چاہتی ہے' اور اس امر کا پورا امکان ہے کہ اس طرح کی تنظیمیں تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کریں' جو بہرحال پاکستان اور اسلام کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

مذہبی جماعتوں کی صورت حال: مذہبی جماعتوں میں پچھلے جمہوری دور کو دیکھ کر یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ اسلام انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا۔ مروجہ سیاست کو اپنا کر اسلام کو غالب نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں انقلاب کا راستہ اپنانا ہوگا۔ لیکن انقلاب کیا ہے؟ کس طرح آتا ہے؟ اس کے بارے میں صاف ذہن نہیں اور غلط فہمی بھی ہے کہ فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے بھڑ جانے کا نام انقلاب ہے۔ حالانکہ انقلاب کے لیے معاشرے میں ایک فکری عمل کو جاری کرنا اور اسے اس حد تک کامیاب بنانا ضروری ہے کہ خواص اور عوام دونوں طبقات کے قابل لحاظ عناصر اس کے قائل ہو جائیں۔

''مسلح جدوجہد'' یا ''گوریلا جنگ'' کا نظریہ کمیونسٹوں کا رہا ہے اور اس جدوجہد یا جنگ کے پیچھے سابق سوویت یونین کی عالمی طاقت کی اعانت بھی رہی ہے' لیکن آخر وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ بندوق بازی سے انقلاب نہیں آسکتا اور نہ بندوق کے زور پر انقلاب کو مسلط رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے معاشرے کو فکری

اور مزاجی طور پر تیار کرنا ضروری ہے۔ اسے تیار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اکثریت بدل جائے کیونکہ اکثریت تو ہمیشہ عوام کالانعام کی رہی ہے۔ اصل حیثیت معاشرے کے ذہین اور فعال طبقات کی ہے۔ اس میں اگر آپ نفوذ حاصل کر لیں' تو بعد میں عوام خود بخود ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے عشروں میں جمہوریت سے مایوسی نے اسلامی انقلاب کا جو نیا ذہن پیدا کیا ہے' وہ اسلام کے لیے ایسی بے صبری اور بے تابی کا ہے جس سے خدا نے اپنے رسول کو منع کیا تھا۔ اس بے صبری کی بنا پر ایک نئے مذہبی مزاج کا بھی ظہور ہوا ہے' جو مار دھاڑ کے ذریعے اسلام اور شریعت کی حکمرانی حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن یہ مزاج اسلامی تحریک کے لیے سخت نقصان کا موجب ہوگا۔

غیر سیاسی مذہب کا رجحان: پچھلے عرصے میں جو غیر سیاسی مذہب بڑی تیزی سے مقبول ہوا ہے' اس کے نتیجے میں بلاشبہ لوگوں کے حلیے تبدیل ہوئے' ان کی عادات و اشغال میں تبدیلی آئی ہے' لیکن اس غیر "سیاسی مذہب" کے نتیجے میں اس سے متاثرہ لوگ معاشرے سے کٹ رہے ہیں اور اس کے لیے اجنبی بن رہے ہیں' حتیٰ کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی ایک الگ مخلوق نظر آتے ہیں۔ ان کی ذہنیت میں غیر ضروری امور اور مباحث میں شدت' اچھے اور نیک انسانوں کی توانائیوں کے ضیاع کا باعث ہو رہی ہے' اور ان کی وجہ سے یہ معاشرے کو بدل نہیں رہے ہیں' بلکہ پاکستانی معاشرے میں جو مختلف معاشرے پائے جاتے ہیں' ان میں ایک نئے معاشرے کا اضافہ کر دیا ہے' جو کسی اور سے میل نہیں کھاتا اور معاشرتی تضاد کو بڑھا رہا ہے۔

اسلامی نظام کی تشکیل جدید کا رجحان: لیکن ان سب کے باوجود معاشرے میں علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کے اس طرزِ فکر کو بھی بڑھاوا ملا ہے کہ مغربی فلسفے اور نظام ناکام ہو چکے ہیں اور مستقبل میں اسلام کی بنیاد پر انسانی اجتماعیت کی جدید تشکیل کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ احساس بھی عام ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کا مقابلہ امریکہ سے ہے' جس پر صیہونیت کا غلبہ ہے اور مستقبل کی بڑی جنگ عالم اسلام اور امریکہ کے مغربی حواریوں کے درمیان ہوگی۔ یہ جنگ ناگزیر ہے اور اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

پاکستانی عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی افسوس ناک سیاسی' اقتصادی صورت حال بھی امریکہ اور اس کی آلہ کار مقامی قوتوں کی پیدا کردہ ہے' اور اپنی اقتصادیات کے لیے بھی مسلمانوں کو امریکہ سے لازماً جنگ آزما ہونا پڑے گا۔ اس طرزِ فکر نے خود حکمران طبقے میں بھی جگہ بنائی ہے اور اب فوج و بیوروکریسی میں بھی اس طرز پر سوچنے والوں کی تعداد کافی ہو گئی ہے۔ تاہم انھیں مختلف مجبوریوں اور موانعات کا بھی خیال ہے' جو انھیں یکسو نہیں ہونے دیتا اور کوئی راہِ عمل وہ اختیار نہیں کر پا رہے ہیں لیکن یہ طرزِ فکر بہرحال موثر اور مقتدر طبقات میں بھی بڑھ رہا ہے اور اپنے وقت پر اثر ضرور دکھائے گا۔ اب ہمارے حکمران اور مقتدر طبقہ کے لیے دل و جان

سے یکسو ہو کر امریکہ کی تابع داری اور خدمت گزاری ممکن نہیں ہوگی۔ جو تضاد امریکہ سے پیدا ہو چکا ہے' وہ بڑھتا جائے گا اور اس سے ایک نئی عظیم الشان تحریک ضرور برپا ہوگی' جس میں عوام کا بھی حصہ ہوگا اور خواص کا بھی۔

معاشرتی اقدار سے غفلت کا رجحان: معاشرے کے اس پہلو کو دیکھ کر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ نفس پرستی اور ذات پرستی کے مرض اور مزاج نے بھی معاشرے میں بہت ترقی کر لی ہے۔ ''حیوۃ الدنیا'' پر جس طرح اب ہر عام و خاص ریجھا ہوا ہے' ایسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے' نمود و نمایش میں لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔ اسراف کا کلچر عام ہے۔ معاشرے میں فکر و نظر' علم و تحقیق' مطالعے اور مکالمے کے کلچر کو زوال ہوا ہے۔ نئی نسل کی تعلیم کا نظام بربادی کی نذر ہو گیا ہے۔ گھروں میں جو اخلاقی' تہذیبی تربیت کا بنیادی ادارہ ہے' بگاڑ داخل ہو گیا ہے۔ بچے گھروں میں بگڑتے ہیں' درس گاہوں میں بگڑتے ہیں' اور عمل کی دنیا میں ان کے کردار کا فساد اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ ہر سینے میں ہوسِ زر ہے۔ مسرت کے حصول کا ذریعہ اقدار نہیں' مادی اشیا ہو کر رہ گئی ہیں۔

اخلاقی انحطاط میں اضافہ: آیندہ جو معاشی بحران آ رہا ہے' اس میں زندگی کے مادہ پرستانہ معیار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوگا' اور اس معاشی انحطاط سے نیا اخلاقی انحطاط جنم لے گا۔ عصمت فروشی' ڈاکے' کاروبار میں دھوکا بازی' یہ سب چیزیں زیادہ ہوں گی۔ نوجوانوں کو روزگار کی خراب صورت حال جرائم کی طرف بھی لے جاسکتی ہے اور تخریبی نظریات کی جانب بھی۔

جنسی بے راہ روی میں اضافہ: سب سے بڑا مسئلہ معاشرے کی جنس زدگی کا ہے۔ ہر طرف سے جنسی جذبات کو اُبھارا جا رہا ہے۔ اخبارات کے اشتہارات سے لے کر فلموں اور ٹی وی پروگراموں تک جنس کا شیطان شرم وحیا کو ختم کر رہا ہے۔ گو یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے مقابلے میں عورتوں میں حجاب کا فیشن چل پڑا ہے۔ چادر اوڑھنے اور منہ چھپانے والیوں کی بازاروں میں پہلے کے مقابلے میں کثرت نظر آتی ہے۔ نماز پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ لوگ عمرے بھی کثرت سے کر رہے ہیں' خیرات کا رجحان بھی ترقی پر ہے' لیکن اب بھی اس خیر کے مقابلے میں شر کا پلڑہ بہت بھاری ہے اور معاشرے کی جنس زدگی ایسی چیز ہے جو اس میں شیطانیت کو عام کر رہی ہے۔ اسی لیے جنسی جرائم اور درندگی کی خبریں عام ہیں۔ اب چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں اور بچے بھی جنسی درندگی کا شکار ہو رہے ہیں اور جنس کا یہ شیطان ہر گھر میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ اخبارات' ٹی وی' انٹرنیٹ ہی کے ذریعے نہیں' ملبوسات کے نئے فیشن' زیب و زینت کی اشیا اور ہار سنگھار کے بہانے بھی ذہنوں میں کج روی پیدا کر رہا ہے' اور سادگی کے کلچر کی جگہ

اس نئے کلچر کے عام ہونے سے بھی ذہن کی معصومیت اور پاکیزگی متاثر ہو رہی ہے۔ مختلف تقاریب' مثلاً شادی میں مہندی کی رسم' یا مخلوط پارٹیوں سے بھی اسے ہوا مل رہی ہے۔

وقت کا تقاضا : معاشرے کی یہ تصویر کشی اس لیے نہیں ہے کہ لوگوں کو مایوس کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ معاشرے کا نیا مزاج متعین کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بگاڑ کی قوتیں اب عالمی نوعیت کی ہوگئی ہیں اور تمام وسائل ان کے ہاتھ میں ہیں۔ انھیں اپنے مطلب کا مزاج متعین کرنے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے مقصد کا کام خود بخود ہو رہا ہے۔ پھر بھی وہ خاص طور پر اپنے مقصد کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے لیے این جی اوز کو متحرک کر رہے ہیں اور اپنے مطلب کی محفلیں منعقد کر رہے ہیں۔ لٹریچر بھی پیدا کر رہے ہیں' جب کہ ہماری کارکردگی بہت کم ہے اور اگر ہم کارکردگی دکھانا چاہتے ہیں' تو یہ کسی ایک خاص جماعت یا گروہ کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اس کے لیے عوام کو حرکت میں لانا ہوگا اور ایک نئے ثقافتی انقلاب کے لیے ہر بستی اور محلے میں نیکی کا مزاج رکھنے والوں کو بلالحاظ سیاسی و مذہبی نظریات کو منظم و یک جا کرنا ہوگا۔ جب سب مل کر کوشش کریں گے تو معاشرے کا نیا مزاج بنا سکیں گے' اور جو مزاج فاسد پیدا ہو چکا ہے' اس کی روک تھام کر سکیں گے۔

اخبار امت

ازبکستان یا جیلستان

محمد ظہیر الدین بھٹی

ازبکستان میں آزادی سے پہلے ہی اسلامی بیداری پائی جاتی تھی مگر اسی کے عشرے کے اواخر میں صدر گورباچوف نے جونہی خودمختاری کی پالیسی کا اعلان کیا' اسلامی بیداری اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ مسلمانوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دینے اور مساجد و مدارس بنانے کا زریں موقع ملا۔ مختلف موضوعات پر ہر طرح کا اسلامی لٹریچر شائع ہونے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لاکھوں مسلمان اپنے دین کی طرف پلٹنے لگے۔

مگر افسوس کہ ازبکستان کے صدر اسلام کریموف نے جب اپنے قدم جما لیے تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک تو صدر کی پالیسی ذرا نرم اور حزم و احتیاط پر مبنی رہی مگر اس کے بعد وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ پہلے اپنے سیاسی مخالفین یعنی علماے اسلام کو قید و بند میں ڈالا' جلیل القدر علما کو اغوا کرایا۔ شیخ عبداللہ اوتار صدر حزب النہضۃ الاسلامی کو ۱۹۹۲ء میں اغوا کرایا۔ شیخ عبدالولی میرزا امام مسجد ''الجامع'' اندیجان شہر کو ۱۹۹۵ء میں ازبک انٹیلی جنس ایجنسی نے تاشقند ایئرپورٹ سے اغوا کر لیا۔

جمہوریہ قارقلپاقستان کے صحراؤں کے وسط اور بحر آرال کے مغرب میں جسلق گاؤں کے قریب واقع جیل کیمپ میں ۲۵۰ افراد کو صدر جمہوریہ کی شخصی آمریت کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ جیل کے ایک ملازم کے بیان کے مطابق یہاں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جنھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محبوس رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ گذشتہ سال یہاں اٹھارہ آدمیوں کو مسلسل جسمانی اذیتیں دی گئیں حتیٰ کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انھیں روزانہ ستر مرتبہ قومی ترانہ گانے پر مجبور کیا جاتا۔ ان کے ہاتھ ان کی گردنوں سے باندھ دیے جاتے اور صبح سے رات گئے تک پورا دن خاموشی کے ساتھ بینچ پر بٹھایا جاتا۔ قیدیوں کے لیے حکم ہے کہ کھانا کھا چکنے کے فوراً بعد وہ باآواز

بلند کہیں ''ہم اس خوراک اور سہولتوں پر اپنے صدرِ محترم اسلام کریموف کے شکرگزار ہیں''۔ اس کے بعد ازبک قومی ترانہ گائیں۔

پورے ملک میں اسلام پسند قیدیوں کی تعداد پچاس ہزار سے زاید ہے۔ یہ اعداد و شمار وسط ایشیا میں حقوق انسانی کے دفاع کی تنظیم کے، جس کا صدر دفتر ماسکو میں ہے، مہیا کردہ ہیں، جب کہ ازبک حکومت صرف ۲۰ ہزار تحریک اسلامی کے کارکنوں کے قیدی ہونے کی معترف ہے۔ قیدیوں کی تعداد اور جیلوں میں ان کی شرحِ اموات میں آئے دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فروری ۱۹۹۹ء میں ازبک راجدھانی تاشقند میں ہونے والے بم دھماکوں کے بعد وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ ہوئی۔ اگرچہ حکومت نے دھماکوں کے فوراً بعد اس کی ذمہ داری بنیاد پرستوں پر ڈالی تھی مگر اہل نظر و اصحاب بصیرت کے نزدیک یہ سرکاری کارستانی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بھی سرکاری آدمی ان دھماکوں میں نہیں مارا گیا۔ امن و سلامتی کے کسی ایک ذمہ دار کو بھی اس کے عہدہ سے برطرف نہیں کیا گیا۔ صدر نے وزیر داخلہ، وزیر خارجہ اور امن عامہ کے ذمہ دار کا محاسبہ کیا نہ سرزنش کی نہ ان پر تنقید کی بلکہ اس کے برعکس ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ان بم دھماکوں کے صرف چند ماہ بعد سلامتی اور امور داخلہ کے سنگ دل اور بدترین سو افراد کے سینوں پر حسنِ کارکردگی کے تمغے سجائے گئے۔

اسلام دشمنی کی انتہا: ازبکستان میں داڑھی رکھنا اور حجاب سرکاری طور پر ممنوع ہیں یعنی ''جرم'' ہیں۔ اسلام دشمنی کی انتہا یہ ہے کہ حکومت نے ''آزادی مذہب آرڈیننس'' جاری کیا ہے جس کی دفعہ ۱۴ کے بموجب پبلک مقامات پر مذہبی لباس پہن کر آنا منع ہے۔ اسی آرڈیننس کی ایک اور دفعہ کی رُو سے باپردہ لڑکیوں اور مستورات کے لیے اداروں اور یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ چنانچہ باپردہ تمام طالبات کو تعلیمی اداروں سے نکال دیا گیا۔ اس آرڈی ننس پر عمل درآمد کرانے کے لیے ذمہ دار افسر مسجدوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہائی اسکولوں کے طلبہ کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے ہیں۔ طلبہ کے لیے قرآن اور نماز سیکھنا بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

باپردہ خواتین کو پولیس سڑکوں سے سیدھا جیل پہنچا دیتی ہے۔ افسوس کہ مسیحی راہبات (nuns) تو شہر میں اپنے مذہبی لباس میں امن و آزادی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں لیکن مسلم خواتین کو یہ آزادی بھی میسر نہیں۔ انھیں ذرائع ابلاغ سب و شتم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ گم کردہ راہ، رجعت پسند اور دقیانوسیت زدہ جیسی پھبتیاں اور طعنے مسلم خواتین کے لیے عام الفاظ بن چکے ہیں۔

بہت سی باپردہ لڑکیوں نے مجبور ہو کر حجاب ترک کر دیا ہے۔ بہت سے کم زور دل مسلمانوں نے

اچانک چھاپے کے خوف سے اپنے گھروں سے قرآن شریف کے نسخے نکال دیے ہیں۔ اس لیے کہ پولیس کے انسپکٹرز قرآن شریف اور عام عربی کتابوں میں امتیاز ملحوظ نہیں رکھتے۔ انھیں تو بس کوئی عربی کتاب ملنی چاہیے' گھر سے ملے یا کار سے۔ عربی میں لکھی ہوئی کسی بھی کتاب کا دست یاب ہونا ان کی ملازمت کو پختہ تر کر دیتا ہے اور جس کے قبضے سے کتاب برآمد ہو جائے اس بیچارے کی شامت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خواہ یہ عربی کتاب صدر اسلام کریموف کی کسی تالیف کا عربی ترجمہ ہی ہو۔

نشانہ ہائے جور و جفا: ازبک سرکار نے حامیان اسلام پر منظم ہلہ بول دیا ہے۔ وادی فرغانہ کے شہر اندیجان کے باشندے نعمت کریموف نے اپنے لخت جگر کی لاش حکام سے گرفتاری کے آٹھ ماہ بعد وصول کی۔ جسم پر مار پیٹ کے واضح نشانات تھے۔ بہت سے خاندانوں نے اپنے جواں سال بیٹوں کی لاشیں اس حالت میں واپس پائی ہیں کہ ان پر تشدد و اذیت دہی کے نشان واضح تھے۔ یہاں پر ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱- **فرحات عثمانوف:** تاشقند کا باشندہ' ۱۴ جون ۱۹۹۹ء کو گرفتار ہوا۔ تشدد کی وجہ سے اسی ماہ ۲۵ جون کو فوت ہوا۔ غسل دیتے وقت معلوم ہوا کہ اس کی کھوپڑی اور دانت پیہم ضربوں سے توڑے گئے تھے۔

۲- **حیات اللہ باباناتوف:** اندیجان کا شہری' ۲۰ نومبر ۹۸ء کو گرفتار ہوا اور ۲۳ مئی ۹۹ء کو بوجہ اذیت دہی جاں بحق ہوا۔

۳- **جلال الدین جمالوف:** اندیجان کا باسی' عمر ۳۷ سال۔ گرفتاری کے چند ہی روز بعد وفات پائی۔

۴- **محمد جان انیوف:** اندیجان کا باشندہ' عمر ۵۵ سال۔ صدر کریموف نے حامیانِ اسلام کی ''سرکوبی'' کے لیے جو فوجی ''عدالتیں'' قائم کی ہیں اسی قسم کی ایک ''عدالت'' نے انھیں ۱۰ فروری ۹۸ء کو چھ سال کی سزا سنائی مگر اس مظلوم نے ۷ فروری ۱۹۹۹ء کو ضرب شدید کی وجہ سے جامِ شہادت نوش کیا۔

۵- **ظولوف عالم جان:** اندیجان جیسے مردم خیز شہر کا مکین۔ اس شہر نے بہت سے علما و فضلا کو جنم دیا مگر ازبک ہلاکو کریموف کے دورِ استبداد میں یہ شہرِ شہدا بن چکا ہے۔ ظولوف عالم ۱۰ فروری ۹۹ء کو چار بجے شام گرفتار ہوا اور اسی تاریخ کو رات دس بجے' اس کی تشدد کے نشانات سے بھرپور نعش گھر پہنچی۔

۶- **احمد خان طوراخانوف:** وادی فرغانہ کے شہر غنعان کا باشندہ' ۵ مارچ ۹۹ء کو ساڑھے پانچ سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس مردِ مجاہد نے ۱۵ جون ۹۹ء کو قید خانہ میں ہی اپنی جان' جانِ آفرین کے حوالے کی۔

۷-الوغ بیگ انواروف : تاشقند سے تعلق' جون ۹۹ء میں گرفتاری عمل میں آئی اور ۹ جولائی ۱۹۹۹ء کو جامِ شہادت پیا۔

۸-عظیموف جوراخان: اندیجان کا باشندہ' ۲۲ فروری ۹۹ء کو گرفتار ہوا۔ ۱۷ اپریل ۹۹ء کو جیل میں وفات پائی۔

ازبکی نمرود نے اپنے وزیر داخلہ زاکیرالماتوف کو تاشقند میں بم دھماکوں کی پہلی برسی کے موقع پر یہ مہم سونپی کہ ازبکستان میں اسلام کے خلاف نہ ختم ہونے والی جنگ کا آغاز کر دے اور ازبکستان سے اسلام کے نام لیواؤں کا قلع قمع کرے۔

ازبکستان کا دینی ادارہ حکومت کے ماتحت ہے' جسے صدر کریموف اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ تقریباً ہر سال ازبکستان کے فقیہ کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مفتی ازبکستان عبدالرشید بحراموف نے حکومت کے دباؤ میں آ کر ۹۹ء میں مساجد میں لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینے کی ممانعت کا فتویٰ جاری کیا اور دلیل یہ دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لاؤڈ اسپیکر نہ تھے۔

ازبک حکمرانوں نے نہ صرف ازبکستان کی حدود میں بلکہ اس کی سرحدوں سے باہر بھی تحریک اسلامی کے کارکنوں کے خلاف اپنی مہم تیز تر کر دی ہے۔ ازبک انتظامیہ کی درخواست پر روسی حکام نے بہت سے ازبک پناہ گزینوں کو گرفتار کیا اور ازبک ظالموں کے سپرد کر دیا۔ یوکرائن اور ترکیہ کی سیکورٹی فورسز نے بھی یہی حرکت کی۔ حالانکہ ایسا کرنا' پناہ گزینوں کے بارے میں موجود بین الاقوامی معاہدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔

ایک طرف یہودی لابی اور مغرب میں حقوق انسانی کی پاسدار تنظیمیں' ایران میں گرفتار یہودیوں کے حق میں' بین الاقوامی سطح پر منظم جدوجہد میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف ازبک مسلم قوم کے ہزاروں مقتولوں اور لاکھوں گرفتار شدگان کے بارے میں کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہو رہی۔

ہم مسلمانوں کی یہ بے حسی کب تک رہے گی؟

پُرامن مسلم ازبک قوم کب تک جان و مال اور اہل و عیال کے بارے میں خوف زدہ رہے گی؟

کب تک فدائیان اسلام قید و بند میں پڑے اذیتیں سہتے رہیں گے؟

کب تک اہل ایمان تشدد و اذیت کا نشانہ بنتے رہیں گے؟

ستم گروں اور آمروں سے نجات پانے کے لیے امت مسلمہ کب اٹھے گی؟

طویل و تاریک شب ظلم کا خاتمہ کب ہوگا؟

رسائل ومسائل

تقدس کا مجروح ہونا

ایک طالبہ کا سوال تھا کہ اس کے والد کے دوست نے ٹیوشن پڑھائی اور اس دوران اسے غلط راہوں پر لے گئے۔ اب اپنی عملی زندگی کے آغاز پر وہ احساسِ گناہ سے پریشان ہے' کیا کرے؟

جواب: آپ کا خط پڑھ کر بہت صدمہ ہوا کہ کسی استاد نے آپ کی سادہ لوحی اور جذباتیت کو ناجائز طور پر اپنی تسکین کا ذریعہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان صاحب کو ہدایت دے اور وہ آپ کی طرح کسی اور طالبہ کو اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب نہ ہوں۔ آپ کے خط سے تین اہم نکات ابھرتے ہیں:

پہلی بات یہ کہ الف نے آپ کے والد صاحب سے اپنے تعلقات اور ان کے اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی غم بھری کہانی آپ کو سنا کر آپ کے دل میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کی اور پھر آپ کے ساتھ نازیبا رویہ اختیار کیا۔ یہ اخلاقی اور قانونی دونوں حیثیت سے ایک جرم ہے۔ اس جرم میں خاموش کردار کی حیثیت سے آپ بھی برابر کی شریک ہیں۔ الف کی طرف سے پہلی مرتبہ جو کوشش ہوئی تھی اس کے بعد آپ کو اس سے قطع تعلق کر لینا چاہیے تھا' چاہے اس کا اثر آپ کی تعلیم پر پڑتا۔

دوسری اہم چیز اس سلسلے میں یہ ہے کہ اسلام وہ واحد دین ہے جو ایک غلطی کرنے والے کو غلطی کے احساس کے بعد احساسِ گناہ سے نکال کر دوبارہ پاک صاف اور حقیقی زندگی میں واپس لے آتا ہے۔ یہ خلوصِ نیت سے توبہ و استغفار کرنے کے نتیجے میں ماضی کو مکمل طور پر محو کر دیتا ہے۔ گویا اب' جب کہ اس تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد آپ کو یہ احساس ہوا کہ آپ نے بھی الف کی طرح غلطی کی تھی اور اب آپ اس احساسِ گناہ سے اپنے آپ کو نکالنا چاہتی ہیں تو اسلام آپ کو امید اور بشارت دیتا ہے اور ماضی کی غلطیوں کو مکمل طور پر احساسِ گناہ سے بالکل پاک کر دیتا ہے۔ سورہ مومن میں اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے' گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے...... (۴۰:۲)۔ گویا گناہ کرنے کے بعد جیسے ہی غلطی کا احساس ہو اور انسان توبہ واستغفار کی طرف مائل ہو'

تو وہ اپنی رحمت سے اپنے بندے کے ماضی کو محو کر کے اسے نئی زندگی دے دیتا ہے۔

غلطی کا صادر ہونا بلاشبہ کمزوری کی علامت ہے لیکن یہ وہ کمزوری ہے جو انسان شیطان کے بہکاوے میں آ کر اکثر کر بیٹھتا ہے۔ حضرت آدمؑ شیطان کے بہکاوے میں آ کر ممنوعہ درخت کے قریب گئے۔ اور پھر جب غلطی کا احساس ہوا تو اللہ رب کریم سے مخاطب ہوئے: ''اے ہمارے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے'' (الاعراف ۷:۲۳)۔

اسی طرح اللہ کے ایک اور نبی حضرت یونسؑ نے جب اللہ تعالیٰ کی اجازت اور حکم کے بغیر اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا۔ لیکن جیسے ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے رب کریم سے دعائیہ استدعا کی: ''نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا'' (الانبیاء ۲۱:۸۷)۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی یہ شان ہے کہ اپنے بندوں سے محبت اور ان پر رحمت کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کرے۔ سورہ ال عمرٰن میں اہل ایمان کے حوالے سے ایک انتہائی اہم زمینی حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود کبھی بھول یا وسوسے کی بنا پر اگر وہ کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو محض کڑھتے نہیں بلکہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ کمالِ محبت سے انھیں معاف کر دیتا ہے۔ فرمایا: ''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں--- ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں--- اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے۔ اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو......'' (ال عمرٰن ۳:۱۳۳-۱۳۴)۔

خط کشیدہ الفاظ کے مفہوم پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آیت ہمارے لیے آج ہی نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم جس طرح گناہ اور بعض اوقات فحش کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، اسے اللہ ہی معاف کر سکتا ہے۔ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

یہاں قرآن یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ صرف شرک ایک ایسا ظلم ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرتا: ''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا'' (النساء ۴:۴۸)۔ مزید یہ کہ: ''اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے'' (۴:۱۱۶)۔

جس غلطی کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے اس کا حل قرآن کریم نے بہت واضح الفاظ میں یوں پیش کیا ہے کہ جو اپنی حرکت سے تائب ہو جائے اور اصلاح کر لے' وہ اس کی نگاہ میں مقبول ہے (النور ۲۴:۵)۔ رب کریم پکار پکار کر اپنے بندوں کو' ہم جیسے کمزور بندوں کو' روشن مستقبل کی خبر یوں دیتا ہے: ''(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو' جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفور و رحیم ہے'' (الزمر ۳۹:۵۳)۔

اپنے اس کرم کا' جان بوجھ کر یا بھول کر غلطی کا ارتکاب کرنے والے کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے گناہوں کو ڈھانک لینے والا' مغفرت کر دینے والا' گناہوں کو دھو کر ایک گناہ گار کو برف کی طرح سفید بنا دینے والا' اپنے عظیم کلام میں یوں مخاطب ہوتا ہے: ''تمھارے رب نے اپنے اوپر رحم و کرم کا شیوہ لازم کر لیا ہے (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو' پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے'' (الانعام ۶:۵۴)۔

کلام الٰہی کے ان واضح ارشادات کے بعد جن میں ہم میں سے ہر غلطی کرنے والے' بھولنے والے' حد سے گزرنے والے' فحش کا ارتکاب کرنے والے کے لیے سرتاسر مغفرت' رحم' بخشش اور محبت ہی محبت ہے' ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اللہ کی مغفرت کی طرف لپک لپک کر' اس کے سامنے سربسجود ہو کر' نم ناک آنکھوں کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف اور پھر کبھی دوبارہ وہ غلطی نہ کرنے کا عزم صمیم کریں' اور ماضی کو یکسر بھول جائیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس میں نہ کوئی ٹیڑھ ہے' نہ ناامیدی' نہ احساسِ گناہ' اور نہ توبہ کے بعد دل میں کسی قسم کی پریشانی۔ اس طرح نئی زندگی کے آغاز کے بعد آپ جس شخص سے بھی عقد کریں گی اس سے ماضی کے اس تلخ تجربے کے تذکرے کی کوئی ضرورت نہیں' اس لیے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا' اسے سچی توبہ نے ایک گناہ کی طرح سے دھو دیا۔

اس سلسلے میں بہترین طریقہ جو سنت مطہرہ سے ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ وضو کر کے تنہائی میں اللہ کے حضور دو رکعت نفل کی نیت کیجیے اور اپنے رب سے خلوص نیت سے توبہ و استغفار کیجیے اور جو کچھ ماضی میں ہوا اس کا ذکر کبھی زبان پر بلکہ ذہن میں بھی نہ لائیے۔ ان شاء اللہ' رب کریم آپ کو ایمان' اعتماد اور قوت کردار دے گا اور آپ اس دنیا میں اور آخرت میں اپنی نیکیوں کا بہترین اجر پائیں گی۔ سچی توبہ کے بعد اپنے بارے میں کبھی یہ بات ذہن میں نہ لائیے کہ آپ کا اپنا کردار کسی سے کم تر ہے (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص قرآن میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہ تو میرا ذکر کر سکے اور نہ (وہ مجھ سے اپنی ضروریات کے لیے) سوال کر سکے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے بڑھ کر عطا کروں گا۔ اللہ کا کلام سارے کائنات کے کلام سے برتر اور اعلیٰ ہے جیسے اللہ اپنی ساری خلقت سے برتر اور افضل ہے (ترمذی)۔

کتاب نما

تیسیر القرآن (جلد دوم) از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی - ناشر: مکتبہ السلام سٹریٹ نمبر ۲۰، وسن پورہ، لاہور۔ صفحات ۶۶۳۔ قیمت: ۲۶۰ روپے۔

تیسیر القرآن کی جلد اول چند ماہ پہلے شائع ہوئی تھی [تبصرہ: جولائی ۲۰۰۰ء]۔ اب دوسری جلد منظرعام پر آئی ہے جو سورہ اعراف سے سورہ الکہف کے ترجمہ وتفسیر پر مشتمل ہے۔ یہ جلد بھی اسی (جلد اول کے) انداز واسلوب پر ہے، جس کا ذکر ہم جلد اول پر تبصرے کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے تفسیر ہٰذا کو حیات مستعار کے آخری ۵ برسوں میں تحریر کیا تھا۔ زیرنظر دوسری جلد کے بعد مزید دو جلدوں میں تفسیر کی اشاعت مکمل ہو جائے گی۔ اس جلد کی اشاعت کو (جلد اول کے تجربے کی روشنی میں) بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ متن قرآن، مفسر مرحوم کا اپنا کتابت شدہ ہے۔ اور یہ وہی متن ہے جسے سعودی حکومت، بہترین نمونۂ کتابت ہونے کی وجہ سے، چھپوا کر حجاج میں تقسیم کرتی ہے۔

اگرچہ پروفیسر نجیب الرحمٰن نے پیش لفظ میں زیرنظر تفسیر کو "علماے سلف کے طرز پر لکھی گئی تمام تفاسیر ماثورہ کی جامع پہلی مفصل تفسیر بالحدیث" قرار دیا ہے لیکن یہ تفسیر کسی خاص گروہی یا فقہی مسلک سے وابستگی پر اصرار نہیں کرتی۔ مفسر مرحوم نے بڑے توازن سے کام لیا ہے اور سابقہ مفسرین سے استفادہ بھی کیا ہے جس کی جھلکیاں اس میں متعدد مقامات پر نظر آتی ہیں۔ مولانا عبدالوکیل علوی نے اس کے تفسیری حوالہ جات کی تخریج و تصحیح کی ہے۔

اس جلد کو بھی حسب سابق نہایت اہتمام کے ساتھ خوب صورت انداز میں اور اچھے طباعتی معیار پر پیش کیا گیا ہے۔ ترجمے اور تفسیر کی کتابت مشینی ہے (رفیع الدین ہاشمی)۔

Quranic Studies: An Introduction از ڈاکٹر اسرار احمد خاں۔ ناشر: فرمان اسلام میڈیا، ۶۸ جالان تنکو عبدالرحمٰن ۵۰۱۰۰، کوالالمپور، ملائیشیا۔ صفحات: ۳۷۳۔ قیمت: درج نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد خاں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی ملائیشیا کے شعبہ قرآن وسنت سے وابستہ ہیں۔ ان

کی اس کتاب میں درسی کتاب کے انداز سے علوم القرآن کے تمام پہلوؤں کا جامعیت اور اختصار سے لیکن بلند علمی معیار سے احاطہ کیا گیا ہے۔ جو افراد انگریزی میں علم دین حاصل کرنا چاہیں' اور ایسے لوگ اب کم نہیں ہیں' ان کے لیے بہت مفید اور بیش بہا کتاب ہے۔

مصنف نے جدید اور قدیم تمام مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ قاری کا تنقیدی نقطۂ نگاہ تشکیل پائے' صرف معلومات نہ ملیں۔ مباحث سے معاصر مفسرین سید ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا امین احسن اصلاحی' حمیدالدین فراہی اور محمد اسد کے قیمتی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کی حفاظت' اسباب نزول' محکمات و متشابہات' مکی اور مدنی سورتیں' سورتوں کی ترتیب' ناسخ منسوخ سب ہی موضوعات پر ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ نظم قرآن کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ایک باب قرآنی اصطلاحات پر ہے جس میں معروف اصطلاحات ایمان' صوم' صلوٰۃ' صبر' شکر' توکل وغیرہ کا مفہوم قرآن میں ان کے تذکرے سے متعین کیا گیا ہے۔ مصنف نے اعجاز القرآن کی بحث کو غیر عربوں کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں زیادہ بحث لغت کی ہے' اس کے بجائے قرآن کی سند (authenticity) پر باب قائم کیا ہے۔

یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ کتاب پاکستان میں کسی شائق کو کس طرح دستیاب ہوگی (مسلم سجاد)۔

بیسوی صدی کے رسولؐ نمبر' پروفیسر محمد اقبال جاوید۔ ناشر: فروغ ادب اکادمی' ۱۰۸ بی سیٹلائٹ ٹاؤن' گوجرانوالہ۔ صفحات: ۵۹۲۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ محبت ایک کلمہ گو کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ خالق کائنات سے محبت کا قرینہ بھی حُبِ رسولؐ سے پھوٹتا ہے' اور ان دونوں محبتوں کا منطقی نتیجہ اُخروی اور ابدی زندگی میں کامیابی ہے۔

گوجرانوالہ کے معروف استاد اقبال جاوید صاحب نے نصرت الٰہی کے سائے میں فرہادی جذبہ کوہ کنی کو بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ انوکھا ہدف منتخب کیا کہ' وہ رسائل' جرائد اور اخبارات کے رسول نمبروں پر تحقیق و تعارف کا کام کریں گے۔ کئی حوالوں سے یہ کام اہم ہے۔ ان خاص اشاعتوں میں بہت سے ایسے لوگوں کے مضامین شامل ہیں جو صاحب کتاب نہ تھے' سو ان کی محبتوں' الفتوں اور بے قراریوں کا حال صرف ان رسائل میں شامل مضامین ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں ایک حد تک روایتی مضامین بھی ہیں' تاہم ان میں مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں کے آشوب عصر کے محسوسات اور حب رسولؐ کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ یوں ان رسائل کا وسیع کینوس' سیرت پاکؐ کی روشنی میں انسانی زندگی کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کا وسیلہ بن گیا ہے۔

جناب اقبال جاوید نے ان مضامین کی گہرائی اور جذبے کی سچائی کو پرکھا اور پھر ہر شمارے سے نظم و نثر کے نمونے منتخب کر کے انھیں زیرنظر کتاب میں پیش کر دیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ فاضل محقق نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

پہلا رسولؐ نمبر نظام المشائخ دہلی (مارچ ۱۹۱۱ء) ہے۔ اس کے بعد پے در پے نمبروں کی بہار ہے۔ آخری نمبر نورُ علی نور کراچی (جولائی ۱۹۹۹ء) ہے۔ ماہ نامہ مولوی دہلی' جولائی ۱۹۲۸ء کا یہ اقتباس پڑھیے (ص ۸۰):

''تمام ادیان و ملل کے بانیوں میں یہ خصوصیت صرف داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے کہ آپؐ کی شخصیت تیرہ صدیوں سے بالکل اپنے حقیقی رنگ میں نمایاں ہے' اور قدرت کی طرف سے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ قیامت تک نمایاں رہے گی۔ انسان کی اوہام پرستی اور اعجوبہ پسندی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس برگزیدہ ہستی کو بھی' جو کمال کے سب سے اعلیٰ درجے پر پہنچ چکی تھی' افسانہ بنا کر اور الوہیت سے کسی طرح متصف کر کے تقلید و پیروی کے بجائے محض ایک تحیر و استعجاب اور عبادت و پرستش کی چیز بنا لیتی' لیکن اللہ تعالیٰ کو بعثت انبیاؑ کے آخری مرحلے میں ایک ایسا ہادی و رہنما بھیجنا مقصود تھا' جس کی ذات انسان کے لیے دائمی نمونہ عمل اور عالم گیر سرچشمہ ہدایت ہو'' (صاحب القرآن فی القرآن' از سید ابوالاعلیٰ مودودی' ص ۳۴)۔

اس انتخاب سے نظم و نثر کی وہ زمینیں' تلازمے اور فکر و بیان کے وہ مضامین اور اسالیب' ایک نظر میں سامنے آجاتے ہیں' جن تک رسائی پانا' عام شائقین کے لیے ناممکن تھا۔ فاضل مرتب نے مدح رسولؐ کے تمام رنگ خوب صورتی اور مقصدیت میں گوندھ کر پیش کر دیے ہیں جس سے اردو صحافت اور مجلاتی و سیرتی ادب میں پیش کردہ سیرت نگاری کی روایت ایک نظر میں سامنے آجاتی ہے (سلیم منصور خالد)۔

خبر و نظر' عبدالحق پرواز رحمانی۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی' چتلی قبر' دہلی۔ صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۵۵ روپے۔

یہ مصنف کے ان کالموں کا انتخاب ہے جو دعوت دہلی میں شائع ہوتے رہے۔ صحافت میں کالم نویسی بہت اہم شعبہ ہے۔ فکاہی کالم اداریوں سے بھی زیادہ دل چسپی اور توجہ سے پڑھے جاتے ہیں اور میرے نزدیک رحمانی صاحب کے کالم ایک اضافی شان یہ لیے ہوئے ہیں کہ طنز و مزاح کی عام روش سے ہٹ کر بالعموم سنجیدہ لب و لہجے میں لکھے گئے ہیں اور نفس مضمون کے لحاظ سے ایک بہت ہی خاص ملّی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

حکمران ہندو اکثریت کی تنگ نظری کی وجہ سے بھارت میں آباد مسلمانوں کے لیے اَن گنت مسائل

پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک طرف انھیں اپنی بقا کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے تو دوسری طرف ان کے سامنے اپنے دین کی حرمت اور تقدس بحال رکھنے کا معاملہ بھی ہے۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہندو' بھارت میں آباد مسلمانوں کو ایک حقیر اقلیت میں بدلنے کی جدوجہد کے ساتھ اپنے کفر کو اسلام سے برتر ثابت کرنے کے پاگل پن میں بھی مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تہذیب اور دین پر تابڑتوڑ حملے کر رہا ہے۔

جناب پرواز رحمانی نے ان کالموں میں دانائی اور بے جگری سے اپنے تمدن اور دین کا دفاع کیا ہے۔ ان کا اسلوب مدلل اور خوب صورت ہے۔ طنز و مزاح کے نشتر ایسی خوبی سے استعمال کیے ہیں کہ متانت پر حرف نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کا مطالعہ بہت توجہ اور شوق سے کرنا چاہیے۔ یہاں پاکستان میں بھی اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ اس میں مسلم آزار تحریکوں کا نمایاں عکس آ گیا ہے جو بھارت میں منظم ہو رہی ہیں اور یہ اس کی بہت بڑی افادیت ہے (نظر زیدی)۔

شوق آخرت' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ناشر: ادارۂ اسلامیات' ۱۹۰-انارکلی' لاہور۔ صفحات: ۹۵۔ قیمت: درج نہیں۔

اس کتاب میں بیماری' عام مصیبت' پریشانی' موت اور برزخ وغیرہ سے متعلق ایسی حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں جو بقول مولانا دریابادی: ''بہترین عیادت اور بہترین تعزیت کا کام دے سکتی ہیں اور ان سے ہر زخمی دل پر ٹھنڈے مرہم کا کام لیا جا سکتا ہے''۔ لیکن احادیث اور اردو ترجمے کے ساتھ مولانا دریابادی کے عالمانہ حواشی بھی قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ دراصل ابتدا میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے شیخ جلال الدین سیوطیؒ کے ایک چھوٹے سے رسالے کی بنیاد پر شوق وطن کے عنوان سے ایک مختصر سا مجموعہ حدیث مرتب کیا تھا۔ مولانا دریابادی نے شوق وطن کے ترجمے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس پر حواشی اور توضیحات کا اضافہ کیا اور متن میں بھی ردّ و بدل کیا۔ کتاب کا نام بھی شوق آخرت کر دیا۔ ان کی یہ تالیف صدق جدید میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ ان اقساط کا مسودہ حکیم عبدالقوی دریابادی کے ذریعے ڈاکٹر تحسین فراقی تک پہنچا جنھوں نے اسے کتابی صورت میں مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

موت کا تصور بالعموم خوف اور دہشت پیدا کرتا ہے--- زیرنظر کتاب میں ایک تو آخرت کی تیاری سے غفلت دور کر کے' اصلی گھر کی طرف مراجعت کا شوق دلایا گیا ہے' دوسرے بشارت کا پہلو نمایاں کر کے قاری کو تسکین و اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے (ر-ہ)۔

انشاے ماجد یا لطائف ادب' مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ناشر: ادارہ علم وفن' ۱۰۸-بی' الفلاح ہاؤسنگ پراجیکٹ' کراچی۔ صفحات: ۵۸۴۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی معروف مفسرقرآن' صحافی اور انشا پرداز تھے۔ تقریباً چار عشرے قبل انھوں نے اپنے ادبی مضامین شائع کیے تھے۔ زیرنظر ادبی تحریروں میں تنقیدی مقالات بھی ہیں' بعض کتابچوں کے دیباچے اور مقدمے' بعض کتابوں پر تبصرے' اور چند نثری مضامین اور متعدد نامور شخصیتوں کے بارے میں فنیاتی مضامین بھی ہیں اور آخر میں مولانا دریابادی کے خطوط۔ گو ان تحریروں کا زیادہ تر تعلق اردو زبان وادب کے مختلف پہلوؤں' کتابوں اور مشاہیر سے ہے' مگر ان میں معاشرتی واخلاقی اور ملّی پہلو بھی نمایاں ہیں۔

مولانا دریابادی مسلمہ طور پر ایک بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ان کی یہ تحریریں ادبی اور تنقیدی اعتبار سے وقعت رکھتی ہیں۔ وہ ایک مخصوص اسلوب کے مالک تھے۔ ایک مثبت اور تعمیری نقطۂ نظر مولانا دریابادی کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے اپنی قلمی کاوشوں خصوصاً ''سچ''' ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کے ذریعے ایک طویل عرصے تک ملّت کی اصلاح احوال کی کوشش کی۔ اردو ادب کے طلبہ کے لیے خاص طور پر زیرنظر مجموعے میں افادیت کا پہلو بہت نمایاں ہے (ر-ہ)۔

مغربی جمہوریت اور اسلام (اقبال کا نقطۂ نظر)' پروفیسر ڈاکٹر محمود علی ملک۔ ناشر: بزم اقبال' ۲ کلب روڈ' لاہور۔ صفحات: ۳۱+۴۰۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

جمہوریت کو عصرحاضر میں سب سے پسندیدہ نظام حکومت قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے''۔ مغربی جمہوریت میں پارلیمان کی کامل خودمختاری ایک اہم اصول ہے مگر: ''اسلامی نظام حکومت میں پارلیمان کی مکمل خودمختاری کا کوئی تصورنہیں ہے کیونکہ یہاں پارلیمان یا شوریٰ اللہ تعالیٰ کی حکومت یا فرمان الٰہی کے تابع ہے''۔ مزید برآں جیسا کہ مصنف وضاحت کرتے ہیں' کامیاب انتخابی نتائج کے لیے اقتصادی مساوات [یہاں ''عدل'' بہتر ہے] اور بلند شرح خواندگی ضروری ہے تاکہ ووٹر یا رائے دہندگان اپنے نمایندے بغیر کسی خوف یا لالچ کے چن سکیں۔ لیکن ایسے معاشرے میں جہاں لوگوں کو معمولی ترغیبات کے ذریعے خریدنا بے حد آسان ہو' اور جہاں ناخواندگی' جہالت اور پسماندگی چھائی ہوئی ہو' وہاں لوگوں کو سستے اقتصادی نعروں یا مذہبی نعروں اور جھوٹے وعدوں اور امیدوں کے ذریعے فریب دے کر گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ مصنف' بجا طور پر کہتے ہیں: ہمارا گذشتہ نصف صدی کا تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ اس طریقہ کار کے ذریعے جاگیرداروں' اور پیشہ ور سیاسی بازی گروں کی ایک بڑی تعداد (جن میں اکثر لوٹے بھی

شامل ہیں) اور مفاد پرست لوگ بار بار اقتدار پر قابض ہوئے ہیں اور یہ ''عوامی نمایندے'' اپنی سفلی خواہشات اور مفادات کو بڑھاوا دیتے ہیں' کرپشن کرتے ہیں اور پھر شرم ناک طریقے اور ذلت و رسوائی کے ساتھ برخاست ہوتے ہیں۔

مغربی اقوام نے جمہوریت کو ایک طرز حیات کے طور پر ترقی دی ہے اور کسی سیاسی لیڈر کے لیے اخلاقی بے راہ روی یا مالی بدانتظامی اور بے ضابطی بہت بڑا جرم ہے (برطانیہ کا پروفیوموسیکنڈل- امریکی صدر نکسن کا واٹرگیٹ سیکنڈل وغیرہ)۔ ڈاکٹر محمود علی ملک نے اسی ضمن میں بتایا ہے کہ آسٹریلیا کے صوبے تسمانیہ کے لبرل وزیراعلیٰ کو پارلیمنٹ میں ایک ووٹ کی برتری حاصل تھی۔ ایک دولت مند اور بااثر تاجر مسٹر رووس' حزب اقتدار کی مخالف لیبر پارٹی کا حامی تھا۔ اس نے ایک لبرل ممبر پارلیمنٹ' مسٹر کاکس کو ایک لاکھ ڈالر کی پیش کش کی تاکہ وہ عدم اعتماد کے موقع پر اپنا ووٹ لبرل حکومت کے خلاف دے۔ مسٹر کاکس نے پولیس کو مطلع کیا' رووس گرفتار ہوگیا۔ سپریم کورٹ نے اسے تین سال قید اور ۴ ہزار ڈالر جرمانے کی سزا سنائی۔ جج نے فیصلے میں لکھا کہ یہ جرم ایک جائز حکومت کی کارکردگی میں خلل ڈالنے کی کوشش تھی جو انتخابات کے ذریعے برسرِ اقتدار آئی تھی۔ اگر رشوت کی پیش کش کا انکشاف نہ ہوتا تو اس سے ریاست کے ایک جمہوری ادارے کی بنیاد کو شدید نقصان پہنچتا (ص ۲۳)۔

مصنف نے آخر میں ایک خاکہ دیا ہے جس کے مطابق مسئلے کا حل یہ ہے کہ زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیریں اور بڑی زمینداریاں ختم کی جائیں' شرح خواندگی میں خاطرخواہ اضافہ کیا جائے' صنعتی اور اقتصادی اصلاحات کے ذریعے معاشی مساوات قائم کی جائے اور تعلیمی اصلاحات نافذ کی جائیں وغیرہ۔

بلاشبہ مصنف نے جمہوریت کے نقائص کی صحیح نشان دہی کی ہے (۳' ۴ صفحوں میں اقبال کے حوالے بھی آئے ہیں) جس سے مسئلے کے بعض گوشے ضرور اُجاگر ہو گئے ہیں' مگر یہ سوال اپنی جگہ تشنہ جواب ہے کہ اصلاحات کون کرے؟ جب تک عوام الناس کی بہت بڑی اکثریت صحیح طور پر تعلیم یافتہ نہ ہو اور ان کے اندر خاطرخواہ شعور' بالغ نظری اور گہرا دینی اور اخلاقی احساس پیدا نہ ہو' اور بڑے پیمانے پر مفاد پرست ابن الوقت سیاست دانوں کے خلاف ایک فضا نہ بنے' وہ بدستور اپنی مَن مانی کرتے رہیں گے اور ایسی اصلاحات ہرگز نہ کریں گے' نہ کرنے دیں گے جن سے خود ان پر زد پڑتی ہو۔

اصل مقالہ انگریزی میں ہے' اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے (ر- ہ)۔

تعارف کتب

☆ قرآنی موضوعات' محمد شریف بقا۔ ناشر: علم و عرفان پبلشرز' ۷-سی ماتھر سٹریٹ' ۹ لوئر مال' لاہور۔ صفحات: ۹۸۰۔ قیمت: ۴۰۰ روپے- [مختلف موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ ہزار عنوانات کے تحت قرآن حکیم سے منتخب آیات مع ترجمہ' حوالہ جات کے ساتھ]۔

☆ شریعت اسلامیہ کے محاسن' شیخ عمر فاروق۔ ناشر: ایشیا پبلی کیشنز' A-9/1 ایشیا منزل' رائل پارک' لاہور۔ صفحات: ۳۳۱۔ قیمت: ۱۵۰ روپے [۴۶ اسلامی' دینی اور اخلاقی موضوعات پر قرآن و سنت' سیرت نبویؐ سیرت صحابہؓ کی روشنی میں مؤثر اظہار خیال۔ اقبال کے برمحل اشعار کے ساتھ' عمومی مطالعے' استفادے اور تلقین و تبلیغ کے لیے ایشیا پبلی کیشنز کی ایک اچھی اور خوب صورت پیش کش]۔

☆ فتنۂ قادیانیت کو پہچانیے' مرتب: محمد طاہر رزاق۔ ناشر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت' حضوری باغ روڈ' ملتان۔ صفحات: ۴۷۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے [قادیانیت پر علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ اقبال سے لے کر' خود مرتب تک کے ۲۱ مضامین کا مجموعہ اور اس موضوع پر مصنف کی متعدد تالیفات میں سے ایک--- قادیانیت کو بے نقاب کرنا مرتب کی زندگی کا مشن ہے]۔

☆ اسلام میں عورت کا مقام' حسن البنا شہید۔ ناشر: اعلیٰ پبلی کیشنز' یوسف مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۱۔ قیمت: ۱۵ روپے [حیثیت و حقوق نسواں کا موضوع' ایک طرح سے عالمی حیثیت اختیار کر گیا ہے--- اسلام کے حوالے سے حسن البنا شہید کی ایک قیمتی تحریر]۔

☆ تعمیر حیات' ابوالحسن علی ندوی نمبر' مدیر مسئول: شمس الحق ندوی۔ ناشر: مجلس صحافت و نشریات دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ صفحات: ۳۵۱۔ قیمت: درج نہیں [مولانا علی میاں کی شخصیت' علمی اور دینی کارناموں اور اصلاح و اتحاد ملت کے لیے ان کی کاوشوں کی تفصیل و تجزیہ اور مشاہدات و تاثرات پر مبنی ۶۱ مضامین اور ۳۰ منظومات--- اپنے موضوع پر ایک جامع اشاعت]۔

☆ غالب --- فکر و فرہنگ' ڈاکٹر تحسین فراقی۔ ناشر: اردو اکیڈمی پاکستان' ۹۳ ے' این پونچھ روڈ' سمن آباد' لاہور۔ صفحات: ۲۴۸۔ قیمت: ۱۲۸ روپے [مرزا غالب پر ۷ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ غالب کی بعض فارسی مثنویات' مہر نیمروز اور فارسی مکاتیب کے حوالے سے ان کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کو پہلی بار تفصیل کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں غالب شناسوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا]۔

☆ انوار یے' پروفیسر انور رومان۔ ناشر: سیرت اکادمی بلوچستان' ۲۷۲-اے او بلاک III سیٹلائٹ ٹاؤن' کوئٹہ۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے [مؤلف کے شخصی تاثرات و احساسات کا بے ساختہ اظہار۔ بظاہر آزاد منظومات' مگر نثری نظم نما تحریریں جن میں ادبیت' شعریت اور آہنگ موجود ہے۔ نقاد انھیں کیا مقام دیتے ہیں؟ مؤلف اس سے بے نیاز ہے۔ انور رومان وسیع المطالعہ اور صاحب دل اہل قلم ہیں۔ ۴۲ اردو' انگریزی کتابوں کے مؤلف' مصنف اور مترجم ہیں]۔

☆ حریم دل' نجمہ منیر' مرتبہ: زاہد منیر عامر۔ ناشر: تناظر مطبوعات' ۳۴۰ ریواز گارڈن' لاہور۔ صفحات: ۳۲۔ قیمت: درج نہیں۔ [آل اولاد' اعزہ و اقربا اور شاگردوں کے نام چھوٹی چھوٹی سادہ خوب صورت نظمیں' قلبی جذبوں اور لگن اور محبتوں کا بے ساختہ اظہار۔ انسانی رشتوں کے باہمی اخلاص اور بے لوث جذبات کا شعری اظہار]۔

☆ انفاق فی سبیل اللہ' خلیل الرحمٰن چشتی۔ ناشر: الفوز اکیڈمی' مکان ۷' ۳۱' گلی ۱۶' ایف ۱۰/۲' اسلام آباد۔ صفحات: ۸۸۔ قیمت: ۳۰ روپے [اس موضوع کے بیش تر پہلوؤں پر قرآن و سنت کے حوالے' عربی متن مع ترجمہ' مختصر تشریحات کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کی ضرورت' اہمیت' فضائل اور فوائد--- یہ رسالہ ''سلسلہ تعلیمات قرآن و سنت'' کی ایک کڑی ہے' اسی سلسلے میں متعدد مفید

رسالے شائع کیے گئے ہیں۔ نماز، رسالت، جہاد فی سبیل اللہ، توحید اور شرک، حقیقت تقویٰ، حقیقت صبر وغیرہ--- طباعتی پیش کش دیدہ زیب اور خوب صورت ہے]۔

☆ **بیت اللہ کے سائے میں،** حافظ جاوید اقبال بھٹی۔ ناشر: اذانِ سحر پبلی کیشنز، کیمرہ مارکیٹ، چیمبرلین روڈ، لاہور۔ صفحات: ۸۰۔ قیمت: ۳۶ روپے [سفر حج کی روداد، بہ شمول مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا تذکرہ اور بیت اللہ اور مسجد نبویؐ کی مختصر تاریخ بہ قول پروفیسر آسی ضیائی: ایک طرح کی گائیڈ بک، ایک رہنما تحریر]۔

☆ **ظلال القرآن** ماہنامہ، مدیر: سید معروف شاہ شیرازی۔ پتا: سی سن پلازا پروپورشن، فلیٹ نمبر ۱۰، مرکز ایف/۱۰، اسلام آباد۔ صفحات: ۴۰۔ قیمت: ۱۵ روپے، سالانہ چندہ: ۱۵۰ روپے [قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ پر ایک نیا مجلّہ۔ اس شمارے سے محمد علی الصابونی کی تفسیر صفوۃ التفاسیر کا ترجمہ شروع ہے]۔

☆ **بچوں کی تربیت میں کتاب کا حصہ،** ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ پتا: سیرت اکادمی بلوچستان، ۲-۲۷ اے او بلاک ۱۱۱، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ [کتابچوں کے اس سلسلے کا ایک کتابچہ، جو یونیسف پاکستان کے تعاون اور اشتراک سے لکھے، تیار کیے گئے۔ ۸ تا ۱۲ صفحات پر مشتمل اس طرح کے کتابچے: احترام بچہ، اسلام اور بچے کی تربیت و نگہداشت، ملی تعمیر نو میں تعلیم کا کردار، بچوں کے لیے لٹریچر کی تیاری میں نفسیات کا کردار--- اساتذہ اطفال کے تربیتی کورسوں کے لیے مفید ہیں]۔

☆ **صمصام الاسلام** از حافظ محمد صدیق ارکانی، ناشر: حرکۃ الجہاد والاسلامی، اراکان (برما)۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: درج نہیں [جہاد پر مختلف مباحث: اقسام، احکام، دفاعی جہاد، اقدامی جہاد، جہاد کے متعلق بعض اہم سوالات کے جوابات]۔

☆ **سیارہ** (ماہنامہ) مدیر: حفیظ الرحمٰن احسن۔ پتا: ایوانِ ادب، اردو بازار، لاہور۔ خاص شمارہ ۴۵، ۲۰۰۰ء۔ صفحات: ۴۲۰۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ [اسلامی اور تعمیری ادب کا نقیب۔ تازہ شمارہ نئی تخلیقات (مقالات، شاعری اور تبصروں) کے ساتھ]۔

☆ **النحو المیسّر**، شفیق احمد خان قاسمی۔ ناشر: شعبۂ نشر و اشاعت، جامعہ خدیجۃ الکبریٰ برائے خواتین، کراچی۔ صفحات: ۸۸۔ قیمت: درج نہیں۔ [علامہ شریف الجرجانی کی معروف درسی تصنیف نحو میر کی عربی زبان ہی میں تسہیل۔ قواعد کی یہ کتاب طلبہ کے لیے مفید ہے۔ مقدمہ از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی]۔

مدیر کے نام

سید سلمان ندوی ' جنوبی افریقہ

ماشاءاللہ! ترجمان القرآن کی آب وتاب قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں اور ترقی دے۔ آپ کا مضمون ''ایم ایم احمد کے انکشافات'' (دسمبر ۲۰۰۰ء) پڑھا جو دل چسپ ہے۔ کاش! آپ نے کچھ مزید تفصیل مہیا کی ہوتی۔ مزید انکشاف کی تشنگی باقی رہی۔ اس مضمون میں ص ۴۲ پر دوسرے پیراگراف میں دو جگہ محمد شعیب کے بجائے شعیب قریشی لکھ دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ص ۴۴ پر آخری پیراگراف میں صحیح نام محمد شعیب لکھا ہے۔ شعیب قریشی مرحوم تو مولانا محمد علی کے داماد اور خلافت کی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ کی مراد محمد شعیب وزیر مالیات سے تھی۔

عبداللہ سولنگی 'لاڑکانہ۔ ہارون اعظم 'مردان۔ اختر علی 'سوات

دسمبر ۲۰۰۰ء کا ترجمان القرآن بہ حیثیت مجموعی عمدہ ہے۔ خاص طور پر امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب قاضی حسین احمد نے کارکنوں کو جو ''ہدایات'' دی ہیں وہ بر وقت' اصولی اور موجودہ حالات میں تحریک اسلامی کے کام کو متوازن انداز میں آگے بڑھانے کے لیے عمدہ لائحہ عمل ہے۔ ''ہدایات'' کارکنوں کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر اسٹڈی سرکل ہونے چاہییں اور نصاب رکنیت میں شامل کیا جانا چاہیے۔ سالارِ کارواں' امیر جماعت اسلامی' قاضی حسین احمد صاحب کی ''ہدایات'' بہت اہم ہیں۔ اسے وسیع پیمانے پر شائع کر کے ہر کارکن' متفق اور ممبر تک پہنچانا چاہیے۔

اللہ داد نظامی ' جھوک نواز' ضلع وہاڑی

ماہنامہ ترجمان القرآن (جون ۲۰۰۰ء) کے سرورق پر شائع ہونے والی آیت میں ایک بڑا سہو ہوا۔ 'معروف' میں 'واؤ' غائب ہے۔ اس پر مزید یہ کہ کسی قاری نے متوجہ نہیں کیا۔ پھر یہ کہ ادارت کے لوگوں کو معلوم ہو گیا' انھوں نے معذرت کو شان کے خلاف سمجھا۔ گویا ماہنامہ ترجمان القرآن کی ساکھ کو قرآنی آیت کی املا کی تصحیح سے زیادہ اہم سمجھ لیا گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کیا آپ اب اس سہو پر معذرت کے قائل ہوئے ہیں یا نہیں؟

تصحیح : ۱- شمارہ دسمبر ۲۰۰۰ء میں ص ۱۳ کی پہلی سطر پر آیت درست اس طرح ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمرٰن ۳:۱۵۹)۔

۲- ص ۲۶ کی پہلی سطر پر آیت درست اس طرح ہے: اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط (البقرہ ۲:۱۳۰)۔

ہم اس سہو پر اللہ سے مغفرت کے طلب گار اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں (ادارہ)۔

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE.